ماہنامہ

مظاہر علوم

سہارنپور



دفتر ماہنامہ
مظاہر علوم
سہارنپور یوپی

اس شمارے میں

○ دائرہ کا سرخ نشان آپ کی مدت خریداری ختم ہونے کی علامت ہے، آئندہ کے لیے رقم ارسال فرمائیں۔

☆ شائع شدہ مضامین سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ جواب طلب امور کے لیے لفافہ اور خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

☆ ماہنامہ، انگریزی ماہ کی ۲/تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ ۱۰/تاریخ تک موصول نہ ہونے پر مطلع فرمائیں۔

نوائے سحر

اولاد کے لئے بہترین تحفہ

عبداللہ خالد قاسمی خیرآبادی

ہندوستان میں سامراجی حکومت کے قیام کے بعد علماء کرام کو سب سے زیادہ فکر جس چیز کی لاحق ہوئی وہ یہ تھی کہ مسلمان بحیثیت مسلمان زندہ رہیں، ان کا دین سے رشتہ قائم رہے، ایمان کی صلابت اور عقائد کی درستگی ان میں باقی رہے، دینی حمیت اور اسلامی غیرت ان سے ختم نہ ہو، اسی فکر اور اسی کرب کے پیش نظر انہوں نے قیام مدارس ومکاتب کی تحریک پورے شد ومد سے شروع کی، اس کا خاطر خواہ اثر ہوا، ملک کے طول وعرض میں جگہ جگہ مدارس اور جامعات اور دینی مکاتب کا قیام ہوا، دین وملت اور ملک وقوم کی تعمیر وترقی میں جن کا مثبت کردار تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔

خاص طور سے دینی مکاتب پورے برصغیر میں اسلامی اساس کو نہایت مضبوط اور پائیدار بنائے ہوئے ہیں، دین اسلام کا فروغ، ملک وملت کی تعمیر اور معاشرتی اصلاح کے لئے مضبوط ذہن سازی انہیں مکاتب قرآنیہ اور مکاتب دینیہ سے ہوتی ہے، اس لئے کہ تعلیم کا معاشرے سے بڑا گہرا اور براہِ راست تعلق ہے۔

لیکن دین اور علم دین سے دوری اور بیزاری کا جو ماحول اور مزاج آج بنا ہوا ہے، مسلمانوں کی نئی نسلوں کے ذمہ دار حضرات جس طرح آج دینی تعلیم کو غیر نافع اور غیر اہم تصور کر رہے ہیں ایسا برا وقت امت پر شاید اس سے پہلے نہیں آیا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ کی روز افزوں ترقی نے آج مسلم معاشرہ کے سامنے ان گنت مسائل کھڑے کر دیئے ہیں، انسانی معاشرتی نظام میں نت نئی تبدیلیاں اتنی تیزی سے آرہی ہیں کہ عقل وحواس

محو حیرت ہیں، غیر اسلامی طاقتیں اپنی تسخیر کے لیے میڈیا اور ذرائع ابلاغ کو نہایت خفیہ انداز میں ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہی ہیں اور معاشرہ کی ساری صالح قدروں پر نقب زنی میں مصروف عمل ہیں، خاص طور سے مسلم معاشرہ میں ان کو خوب خوب رواج دیا جا رہا ہے اور ایک طرح سے ذہنوں سے اسلامی قدروں کو پامال کرنے اور دینی شعائر کو فرسودہ تصور کرانے کی مہم چلا رکھی ہے، مسلمانوں کی نئی نسل کو گرفتار مکر و فریب کر کے ان کے ایمان اور ان کی روحانی وراثت کو سلب کیا جا رہا ہے، گویا خوش رنگ اور دیدہ زیب حلوہ زہر ملا کر پیش کرتے ہیں اور معاشرہ اس سے لذت کام و دہن حاصل کرتا ہے لیکن اس کے مہلک اثرات سے بے خبر ہو کر، اس کے نتیجہ اور انجام سے لاپرواہ ہو کر۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے قوم کی نئی نسل اسلام سے بیزار ہوتی جا رہی ہے۔

۱۴۲۵ھ میں جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے باوقار حضرات سرپرستان نے یہ اہم فیصلہ کیا کہ دین اور علم دین سے بے بہرہ اور دینی تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ علاقوں میں قرآن کریم کے چھوٹے چھوٹے مکاتب قائم کئے جائیں اور قوم کی نئی نسل کی اس انداز میں تربیت کی جائے کہ ان کا دین و ایمان محفوظ رہے، عقائد درست رہیں، اخلاق و کردار کی بلندی حاصل ہو، دین بیزاری کی جو فضا عام ہوتی جا رہی ہے اس کی زہرناکی کو ختم کیا جائے۔

الحمدللہ مظاہر علوم، جس نے ملک وملت کی بے لوث خدمات انجام دیں اور مغربی تہذیب، عیسائی مشنریوں، الحاد و زندقہ کے سم قاتل سے معاشرہ کو بچایا، جگہ جگہ مکاتب قائم فرمائے اور قائم کر رہے ہیں، جو تعلیم کے نام پر الحاد پھیلانے والوں اور الوہیت کا غلط تصور پیدا کرنے والوں کے لئے بڑا چیلنج ہیں، اس سلسلہ میں اپنا ایک مستحکم نظام ہے، جو ارباب مدارس کے لئے ایک نمونہ ہے اور اس طریقہ کو اختیار کرنے میں ملک وملت کا بڑا نفع ہے اس نے اپنے بجٹ سے قیام مکاتب کے لئے کئی لاکھ روپئے سالانہ کی منظوری دی ہے۔

جامعہ مظاہر علوم نے اس عظیم مقصد کے لئے جفاکش، مخلص اور دیندار معلموں کا انتخاب فرمایا، اور باقاعدہ اس کے لئے ذمہ دار اساتذہ اور ارباب انتظام پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی ہے جو

الحمدللہ بڑی تندہی اور جانفشانی سے مصروف کار ہے اوراس کے بہتر نتائج سامنے آرہے ہیں۔

مدرسہ مظاہرعلوم سہارنپور سے ملحق صوبہ ہریانہ و پنجاب میں مکاتب دینیہ کے قیام کا جوسلسلہ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ سے شروع ہوا تھاوہ بدستور جاری ہے،اور الحمدللہ تقریباً ستر (۷۰) مکاتب کا قیام عمل میں آچکا ہے اوران میں جن مکاتب کے قیام کو کافی عرصہ گذر گیا اور وہاں کی کارکردگی قابل اطمینان اور معتبر مقدار میں ہوگئی ہے ایسے مکاتب سے متعلق ہمارے اساتذہ کرام جوان مکاتب کی اہتمام کے ساتھ نگرانی فرمارہے ہیں ان کا مشورہ ہوا کہ کسی ایک جگہ پر قرب وجوار کے مکاتب کے طلبہ کو جوڑ کر وہاں کے طلبہ کی حوصلہ افزائی اوران کے والدین واولیاء کی تشجیع و تشویق کے لئے ایک پروگرام رکھا جائے اور طلبہ کو انعام دیا جائے،سب مکاتب کا ایک جگہ اجتماع تو دشوار ہے کیونکہ ان دیہی علاقوں میں نہ مکاتب و مدارس کا نظام ہے، نہ ان کے یہاں دینی وتعلیمی اجتماعات کا ماحول، چند مقامات پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے پانچ، چھ مکاتب کے طلبہ کو جوڑلیا جائے،مختصر وعظ ونصیحت کے بعد درجات تعلیم کے اعتبار سے من جانب مظاہرعلوم ان کے درمیان انعام تقسیم کردیا جائے۔

ابھی گذشتہ ماہ مکاتب دینیہ کی کارکردگی کواور فعال بنانےاور وہاں تعلیم پانے والے طلبہ اوران کے والدین وسرپرستان کے ذہن و دماغ میں دین اور علم دین کی طرف تشویق وترغیب کے لئے انعامی جلسوں کا یہ نظام بنایا گیااور الحمدللہ اس کے بڑے مثبت،مؤثراور قابل تقلید مظاہر سامنے آئے۔

ابتدائی دینی تعلیم کیلئے مدارس اسلامیہ کے تحت مکاتب کے قیام کا سلسلہ موجودہ حالات میں خصوصاً بہت ضروری ہے،آج بڑے بڑے جامعات اور مدارس قائم ہوکرامت کی دینی تعلیمی ضرورت پوری کررہے ہیں لیکن شدید ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ قوم کی نئی نسل کی ابتدائی دینی ذہن سازی اوران کی فکری نشو ونما کی فکر بھی کی جائے،حضرت مولانا محمد میاں صاحب دیوبندیؒ فرماتے ہیں:

قرآن کریم اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مبارکہ نے جو ہمارا فرض مقرر کیا ہے،

اس کے ادا کرنے کی سب سے اچھی صورت تو یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو خود پڑھائیں، اسلام کے احکام اور اس کے بتائے ہوئے آداب کے خود بھی پابند اور عادی ہوں اور بچوں کو بھی پابند اور عادی بنائیں، بے شک ہماری دلی آرزو رہتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ قیمتی عطیہ اپنی اولاد کو دیں اور ان کے لئے دولت کے انبار چھوڑ کر جائیں، مگر ہمیں کبھی بھی یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ ہمارے رسول رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم جو اپنی امت کے لئے رؤف ورحیم تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشفقانہ وصیت یہ ہے: ''**مانحل والدٌ ولداً من نحلٍ، افضل من ادب حسن**'' یعنی کسی باپ نے اپنی اولاد کو اچھی تعلیم وتربیت سے بہتر کوئی تحفہ نہیں دیا۔ (ترمذی، حدیث ۱۹۵۲)۔

ہماری یہ دینی تعلیم وتربیت، اپنی اولاد کے لئے بہترین عطیہ، سب سے زیادہ قیمتی ترکہ اور ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی بہت زیادہ جائیداد اور جاگیر ہوگی، صبح یا شام کا صرف ایک ڈیڑھ گھنٹہ بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے مخصوص کرلیں اور تعلیم وتربیت کے حلقے میں شامل کرلیں تو اس طرح ہر لکھے پڑھے مسلمان کا گھر تعلیم دین کا مکتب اور تربیت گاہ بن جائے گا اور بغیر پیسہ خرچ کئے مفت میں وہ کام ہوجائے گا جس کے لئے کروڑوں اربوں روپے کی ضرورت ہے۔ (طریقۂ تعلیم، ص ۲۳، ۲۴، ۲۵)۔

قیام مکاتب کے سلسلہ میں حضرت شیخ الہندؒ کا یہ ملفوظ جو انہوں نے مالٹا کی جیل سے واپسی کے بعد فرمایا تھا کس قدر اہم اور چشم کشا ہے:

فرمایا: میں نے جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہورہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں ایک ان کا قرآن پاک کا چھوڑ دینا دوسرے آپسی اختلاف وخانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں گا کہ قرآن پاک لفظاً ومعناً عام کیا جائے بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کئے جائیں بڑوں کو عمومی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیم اور اس پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے۔

درسِ قرآن

تیسری قسط

بدعمل عالم کی سزا

مولانا محمد ساجد حسن سہارنپوری استاذ حدیث وتفسیر مظاہر علوم سہارنپور

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ، وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَ لَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَ اتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذَٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (الاعراف ۱۷۶)

اورسنادے ان کو حال اس شخص کا جس کو ہم نے دی تھیں اپنی آیتیں، پھر وہ ان کو چھوڑ نکلا، پھر اس کے پیچھے لگا شیطان ——— تو وہ ہوا گمراہوں میں سے، اور اگر ہم چاہتے تو بلند کر دیتے اس کا رتبہ ان آیتوں کی بدولت لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور چلا اپنی خواہش پر اور اپنی من مانی کرنے لگا ——— تو اس کا حال ایسا جیسا کتّا، اگر تو اس پر بوجھ لادے تب بھی ہانپے اور نہ لادے تب بھی ہانپے، یہی حالت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو، تو بیان کر دیجئے یہ احوال شاید وہ دھیان کریں۔

شانِ نزول: حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد، عطیہ واکثر مفسرینؒ کی رائے کے مطابق مذکورہ بالا آیات شریفہ کا تعلق بلعم بن باعورا سے ہے جو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں ایک بڑا عالم، اسم اعظم جاننے والا، مستجاب الدعوات، صاحب کرامات وصاحب تصرف درویش تھا۔

مگر آخر میں سفلی خواہشات، دنیاوی شہوات ولذات پر مر مٹا اور اپنے علم کے مقتضیٰ پر اس نے عمل نہ کیا، ——— تو اس کو دائمی ذلت نصیب ہوئی، ابدی طور پر مردود، راندۂ درگاہ ہوا، ساری کرامتیں چھن گئیں، دنیا میں خسیس وذلیل، آخرت میں عذابِ عظیم کا مستحق ٹھہرا۔

بندر وخنزیر بنا دئے گئے:

حضرت عیسیٰؑ کے حوارین، صادق الایمان اور راسخ الاعتقاد، مگر سادہ لوح تھے، سادگی و سادہ دلی کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ درخواست کی کہ جس خدائے برتر میں یہ لا محدود طاقت ہے کہ اس نے بغیر باپ کے آپ کی ذات اقدس کو وجود بخشا اور آپ کی تصدیق نبوت ورسالت کے لئے آپ کے ہاتھوں نشانات ومعجزات کو ظاہر فرمایا، اس خدا میں یہ طاقت بھی ضرور ہوگی کہ وہ ہمارے لئے غیب سے ایک دسترخوان نازل کردیا کرے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو نصیحت فرمائی کہ اگرچہ خدا کی طاقت، بے غایت اور بے نہایت ہے لیکن کسی سچے بندہ کے لئے یہ زیبا نہیں کہ وہ اس طرح خدا کو آزمائے، تو خدا سے ڈرو اور ایسے خیالات سے بچو!

یہ سن کر حواریوں نے جواب دیا کہ ’’حاشا ہمارا یہ مقصد نہیں،، ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ خدا کے اس عطیہ کو زندگی کا سہارا بنالیں اور آپ کی تصدیق میں ہم کو حق الیقین کا اعتقادِ راسخ حاصل ہوجائے اور ہم اس کی خدائی پر کائنات انسانی کے لئے شاہد عدل بن جائیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب ان کا بڑھتا ہوا اصرار دیکھا تو بارگاہ الٰہی میں دعا کی ’’اے خدا! تو ان کے سوال کو پورا کر اور آسمان سے ایسا مائدہ (دسترخوانِ نعمت) نازل فرما کہ وہ ہمارے لئے، اول وآخر سب کے لئے خوشی کی یادگار (عید) بن جائے اور تیرا ’’نشان‘‘ کہلائے اور اس ذریعہ سے ہم کو اپنے غیبی رزق سے شادکام کر کیونکہ تو ہی بہتر رزق رساں ہے۔ اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی: عیسیٰ تمہاری دعا قبول ہے، میں اس کو ضرور نازل کروں گا، لیکن اس کے استعمال کے دو ادب ہیں، پہلا ادب یہ ہے کہ خیانت نہ کریں یعنی دسترخوان پر انواع واقسام کی چیزیں موجود ہوں گی ایسا نہ ہو کہ عمدہ واچھی اچھی چیزیں دوسرے ساتھیوں سے پہلے کھالیں، یا دوسروں سے زیادہ کھالیں (لا یخونو ابقصد اکل الاحسن او

الاکثر) بلکہ دوسرے ساتھیوں کا بھی کیفیت ومقدار میں خیال رکھیں، دوسرا ادب یہ کہ آئندہ کے لئے ذخیرہ بنا کر نہ رکھیں۔

واضح رہے کہ اس کے بعد اگر ان میں سے کسی نے بھی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی تو پھر ان کو ایسا ہولناک عذاب بھی دونگا جو کائنات کے کسی انسان کو نہیں دیا جائیگا بقول حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ اور عمار بن یاسرؓ اس دسترخوان کا نزول ہوا، فرشتے آہستہ آہستہ اس کو لئے ہوئے اتر رہے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام انتہائی خضوع وخضوع کے ساتھ درگاہ الٰہی میں بدست دعا تھے، لوگوں کی آنکھوں دیکھتے خدا کے فرشتے فضاء آسمانی سے اس کو لیکر اترے اور مائدہ آپہونچا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اول دو رکعت نماز شکر ادا کی اور پھر مائدہ (خوان) کو کھولا، خوان کھولتے ہی ایسی نفیس خوشبو نکلی کہ اس کی مہک نے سب کو مست کر دیا، دسترخوان میں تلی ہوئی مچھلیاں، ترو تازہ پھل اور روٹیاں موجود تھیں، حضرت عیسی علیہ السلام نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کھائیں، تب ہزارہا بندگان خدا نے شکم سیر ہو کر کھایا مگر مائدہ کی مقدار مین کوئی فرق نہیں آیا، مگر وہ مذکورہ بالا دونوں ادب ملحوظ نہ رکھ پائے اور حکم خداوندی کی خلاف ورزی کی، اللہ کا غضب نازل ہوا، کچھ کو بندر اور کچھ کو خنزیر بنا دیا گیا۔ **اعاذنا اللہ منھا۔**

حضرت عمار بن یاسرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آسمان سے روٹی اور گوشت والا دسترخوان نازل ہوا اور حکم دیا گیا کہ خیانت نہ کرنا، اور اگلے دن کے لئے جمع نہ کرنا، لیکن انہوں نے خیانت کی اور ذخیرہ اندوزی کی، اور اگلے روز کے لئے اٹھا کر رکھا چنانچہ ان کو بندروں اور سوروں کی شکل میں بدل دیا گیا۔

وعن عمار بن یاسر قال: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ أُنْزِلَتِ الْمَائِدَۃُ مِنَ السَّمَاءِ خُبْزًا وَلَحْمًا، وَ أُمِرُوْا أَنْ لَا يَخُوْنُوْا وَلَا يَدَّخِرُوْا لِغَدٍ، فَخَانُوْا وَادَّخَرُوْا وَرَفَعُوْا لِغَدٍ، فَمُسِخُوْا قِرَدَۃً وَخَنَازِيْرَ،

(ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، رقم الحدیث ۳۰۶۱)

سخت ترین عذاب: محدود زندگی میں آدمی کو طرح طرح کے لوگوں سے کام کرانے کا سابقہ پڑتا ہے، اپنوں سے بھی بیگانوں سے بھی، اگر کام کی انجام دہی میں بیگانے غفلت وکوتاہی کریں یا سرے سے اس کام کو انجام ہی نہ دیں تو آدمی کو اتنا رنج وتکلیف نہیں ہوتی جتنی تکلیف اپنوں کے نہ کرنے سے ہوتی ہے،اور بیگانوں پر اتنا غصہ نہیں آتا جتنا غصہ کام نہ کرنے کی وجہ سے اپنوں پر آتا ہے،

ان پڑھ، جاہل عوام بھی اللہ کی مخلوق ہیں اور عالم بھی،مگر عوام الناس، جاہل، ان پڑھ کی بدعملی پر اللہ تعالی کو اتنا غصہ نہیں آتا جتنا علما کے اپنے علم پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے آتا ہے کیونکہ علما اللہ تعالی کے خاص بندے ہیں اس لئے ان کی بدعملی پر سخت سزا دی جائے گی۔اور

قیامت میں جن لوگوں کو سخت ترین عذاب دیا جائیگا ان میں بے عمل عالم بھی داخل ہے،حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ قیامت کے روز جن لوگوں کو سخت عذاب دیا جائیگا ان میں ایک وہ شخص ہے جس نے نبی کو قتل کیا یا نبی کے ہاتھوں قتل ہوا، دوسرا وہ شخص ہے جس نے والدین میں سے کسی ایک کو قتل کردیا، تیسرا تصویر بنانے والا، چوتھا وہ آدمی جس نے اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کیا۔

وَعَنِ ابْنِ عَبّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ:قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:إِنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، مَنْ قَتَلَ نَبِيًّا، أَوْ قَتَلَهُ نَبِيٌّ، أَوْ قَتَلَ أَحَدَ وَالِدَيْهِ، وَالْمُصَوِّرُونَ، وَعَالِمٌ لَمْ يَنْتَفِعْ بِعِلْمِهِ. (شعب الایمان رقم ۷۵۰۴:)

علم غیر نافع سے پناہ: آدمی کی طبیعت اگر اس کو اپنے علم پر مجبور کر رہی ہے اور علم پر عمل کی توفیق مل رہی ہے تو یہ علم نافع ہے اور اگر علم تو ہے مگر توفیقِ عمل سے محروم ہے تو یہ علم غیر نافع ہے،حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول وماثور دعاؤں میں علم نافع کی طلب اور علم غیر نافع سے پناہ مانگنے کا حکم موجود ہے،حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

اللہ سے علم نافع مانگا کرو اور علم غیر نافع سے اللہ کی پناہ مانگا کرو۔

عن جابر رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال :سلوا اللہ علما نافعا و تعوذوا باللہ من علم لاینفع۔(لابن عبدالبر ۱/۶۲۵)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خود معمول مبارک بھی یہی تھا، حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے: اے اللہ! میں اس علم سے جو نفع نہ دے، اس دل سے جو تجھ سے ڈرتا نہ ہو، اس نفس سے جو سیر نہ ہوتا ہو اور اس دعا سے جو قبول نہ ہو تیری پناہ مانگتا ہوں۔

عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ، قَالَ: اللهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ، وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ، وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ، وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا،

أخرجه مسلم في الصحيح، باب التعوذ من شر ما عمل ومن شر ما لم يعمل، الرقم/۲۷۲۲

پیغام:

نبی کی مخالفت علمی، عملی، اعتقادی، لسانی، (زبانی مقابلہ آرائی) کسی بھی طرح کی ہو اس سے حد درجہ احتراز لازم ہے، صاحب کرامات وصاحب تصرف، مقبولِ بارگاہ، صوفی ودرویش اس کی وجہ سے مردود ٹھہرا۔

وہ عالم جو علم وہدایت کو چھوڑ کر نفسانی خواہشات کی طرف متوجہ ہو، اس ہوا پرست عالم کے لئے بھی غایت درجہ کی عبرت ہے مذکورہ آیت شریفہ میں جس کو ایسے خسیس وحریص ترین جانور کے مماثل قرار دیا گیا جس کو غلاظت، متعفن، مردار، شیریں تر حلوہ سے زیادہ لذیذ ہے۔۔۔۔۔**اللھمّ انی اعوذبک من علم لاینفع و من قلب لایخشع و من نفس لاتشبع و من دعاء لایسمع۔**

معارف، بیان القرآن، مظہری ۳/۳۱۳، صاوی ۲/۱۰۹۔ جمل ۲/۲۱۱

انوارِ حدیث

گذشتہ سے پیوستہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند اہم نصیحتیں

مولانا محمد خالد سعید اعظمی استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

۳-**تَعَرَّفْ إِلَيْهِ فِي الرَّخاءِ يَعْرِفْكَ فِيْ الشِدَّةِ**: تم فراخی اور خوش حالی میں اللہ کو اپنی معرفت اور پہچان کرواتے رہو تو وہ مصیبت اور پریشانی میں تمہیں پہچانے گا۔

یعنی بندہ جب خوش حالی، آسودگی اور صحت وعافیت کے زمانے میں اللہ سے ڈرتا ہے، اس کے حدود کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے حقوق کو ادا کرتا ہے تو اس بندے کی اللہ کے یہاں ایک خاص معرفت اور پہچان قائم ہوجاتی ہے، چنانچہ جب اس بندے پر سخت حالات آتے ہیں اور وہ پریشانیوں اور مصیبتوں سے دو چار ہوجاتا ہے تو اللہ تعالی اس سختی اور پریشانی میں اسے پہچانتے ہیں اور اس بندے نے آسودگی اور فراخی کے وقت میں اپنے رب سے جو معرفت قائم کی تھی اللہ تعالی اس معرفت کی رعایت فرماتے ہیں اس کی دعا قبول فرماتے ہیں اور پریشانیوں سے نجات عطا فرمادیتے ہیں۔

معرفت کی دوقسمیں: حافظ ابن رجبؒ فرماتے ہیں کہ معرفت عبد یعنی بندے کا اپنے رب کو پہچاننا اور اس کی معرفت حاصل کرنا، اس معرفت کی دو نوع ہیں:

۱-**عمومی معرفت** یعنی اللہ کا اقرار کرنا، اس کی تصدیق کرنا اور اس پر ایمان لانا، یہ معرفت تمام مؤمنین کو حاصل ہوتی ہے۔

۲-**خصوصی معرفت** جس کا تقاضا یہ ہے کہ قلب کا میلان بالکلیہ طور پر اللہ کی طرف ہوجائے، اسی سے انسیت ہو اور اسی کے ذکر سے اطمینان حاصل ہو اور اس سے حقیقی حیا پیدا ہوجائے اور اس کی ہیبت اور خوف دل میں بیٹھ جائے اسی خصوصی معرفت کے لیے عارفین سرگرداں و کوشاں رہتے ہیں، کسی عارف باللہ کا قول ہے کہ مسکین تو دنیا دار لوگ ہیں جو دنیا

سے اس حال میں رخصت ہوگئے کہ دنیا کی سب سے مزے دار چیز چکھی بھی نہیں، جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ سب سے لذیز چیز کیا ہے تو فرمایا کہ اللہ عزوجل کی معرفت۔

واقعی کیسی سچی بات کہی ہے لیکن اس کا ادراک لذت آشنا ہی کو ہوسکتا ہے۔

اسی طرح معرفت رب یعنی رب کا اپنے بندوں کی معرفت رکھنا اس کی بھی دو نوع ہیں:

۱۔عمومی معرفت یعنی اللہ سبحانہ وتعالی کا اپنے بندوں کا علم رکھنا ان کے ظاہر و باطن ہر چیز سے مطلع رہنا جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الإِنْسَانَ وَنَعلم ما تُوَسْوِسُ بِهٖ نفسه(ق:۱۶) (یقینا ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے نفسانی خطرات ہم خوب جانتے ہیں) اور دوسری جگہ ارشاد ہے: **هُوَ أعلَمُ بكم اِذْ أَنْشَأكم مِن الأَرض واِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فی بطونِ أمّهٰتِكم(النجم:۳۲)** وہ تمہیں خوب جانتا ہے جب کہ اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماں کے پیٹوں میں جنین تھے۔

۲۔خصوصی معرفت: اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ بندے سے محبت کرنے لگے، اسے اپنا قرب عطا فرمائے، اس کی دعاؤں کو قبول فرمائے اور شدتوں اور پریشانیوں سے نجات عطا فرمائے۔(جامع العلوم والحکم ص ۱۸۷)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی "**تعرف إليه في الرخاء يعرفك في الشدة**" میں مذکورہ بالا خصوصی معرفت ہی مراد ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص خوشی وفراخی کی حالت میں اللہ تعالی کی طاعت اور تقویٰ کو لازم پکڑتا ہے اللہ تعالی مصیبت و پریشانی کے وقت میں اس کے ساتھ لطف ومہربانی کا معاملہ فرماتے ہیں اور اس کی نصرت فرماتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **مَنْ سَرَّہ اَنْ يستجيب اللّٰہُ له عند الشدائد والكُرَب فليُكثر الدعاءَ في الرخاء**(الترمذی ۲/۱۷۵) جسے اس بات سے خوشی ہو کہ اللہ تعالی شدتوں اور پریشانیوں میں اس کی دعا قبول فرمائیں تو اسے آسودگی (صحت وعافیت، خوش حالی وفارغ البالی) میں اللہ سے خوب دعائیں کرنی چاہئیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی اپنے پیٹ میں لے کر سمندر کی تہہ میں پہونچی تو اسی حال میں انہوں نے اللہ سے دعا کی اور اللہ کی تسبیح کی ’’لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ انتَ سُبۡحَانَکَ اِنِّی کنتُ من الظالِمین ‘‘ ان کی تسبیح سن کر فرشتے کہنے لگے کہ اجنبی جگہ سے یہ جانی پہچانی آواز آرہی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم جانتے نہیں یہ میرے بندے یونس ہیں، فرشتے کہنے لگے وہی یونس جن کا نیک عمل رات دن آپ کے پاس آتا تھا؟ اللہ فرمائیں گے کہ ہاں وہی یونس — اس وقت فرشتے اللہ سے ان کی سفارش کریں گے اور کہیں گے کہ اے پروردگار! آسودگی اور آسانی میں انہوں نے جو اعمال کیے ہیں ان کی وجہ سے آپ ان پر رحم فرما کر اس مصیبت سے نجات نہیں عطا فرمائیں گے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کیوں نہیں ، پھر اللہ نے مچھلی کو حکم فرمایا تو اس نے حضرت یونسؑ کو لا کر ساحل پر ڈال دیا۔

(رواہ الطبری فی تفسیر سورۃ الصافات: ۱۰۰/۱۲ ا، عن أنس، والبزار فی مسندہ: ۵ ا /۳۴ عن ابی ھریرۃ)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آدمی خوش حالی میں کثرت سے دعا کرتا ہے اور پھر اس پر کوئی مصیبت و پریشانی آجاتی ہے اور وہ اللہ سے دعا کرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں کہ جانی پہچانی آواز ہے، لہٰذا اس کے لئے وہ سفارش کرتے ہیں اور جب آدمی خوش حالی میں کثرت سے دعا نہیں کرتا اور پھر اس پر کوئی مصیبت آجاتی ہے اور وہ اللہ سے دعا کرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں کہ غیر معروف آواز ہے لہٰذا وہ اس کیلئے سفارش نہیں کرتے۔ (جامع العلوم والحکم، ص ۱۸۸)

بہر حال جب بندہ اللہ کو خوش حالی میں یاد کرتا ہے، اس کی اطاعت کرتا ہے تو شدت و پریشانی کے وقت میں اللہ تعالیٰ اسے یاد رکھتے ہیں اور اس کی مدد فرماتے ہیں اور پریشانیوں سے نجات عطا فرماتے ہیں، اور دنیا میں سب سے بڑی شدت اور سختی جو بندے کو پیش آتی ہے وہ موت ہے اور اگر بندے کا انجام خیر نہیں ہے تو موت کے بعد کے مراحل اور بھی زیادہ سخت ہوں گے، لہٰذا مومن کیلئے ضروری ہے کہ وہ صحت و عافیت کے زمانے میں تقویٰ اختیار کر کے اور اعمال صالحہ کر کے موت اور مابعد الموت کی تیاری کر لے، تاکہ اللہ تعالیٰ موت کی شدت کے وقت اور اس کے بعد کی شدتوں اور پریشانیوں کے وقت میں اسے یاد رکھیں، اور تمام پریشانیوں سے اسے نجات عطا فرمادیں۔

اسلام کا اخلاقی انقلاب

مولانا محمد اللہ خلیلی قاسمی

کوآرڈنیٹر دارالافتاء ویب سائٹ، دارالعلوم دیوبند

معاشرتی واجتماعی زندگی کے بنانے اورسنوارنے میں اخلاق کونمایاں حیثیت حاصل ہے، بلکہ معاشرت کی پہلی اینٹ اخلاقِ حسنہ ہی ہیں، حسن اخلاق کے بغیر انسان نہ صرف یہ کہ انسان نہیں رہتا؛ بلکہ درندگی وبہیمیت پر اتر آتا ہے، انسانیت کا زیور حسنِ اخلاق ہے؛ لیکن چھٹی صدی عیسوی میں دنیا اخلاقی اعتبار سے کنگال اور دیوالیہ ہوچکی تھی، انسانیت وشرافت کی بنیادیں ہل چکی تھیں، تہذیب و اخلاق کے ستون اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے، تہذیب وتمدن کے گہواروں میں خودسری، بے راہ روی اور خلاقی پستی کا دور دورہ تھا، روم وایران اخلاق باختگی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جارہے تھے، شراب عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی، جو جاہلی معاشرے میں بڑائی اورخوبی کی بات تھی، سودی لین دین، کمزوروں کا استحصال اوراس سلسلے میں بے رحمی وسخت گیری عام تھی، بے شرمی وبے حیائی، رہزنی و قزاقی معمولی بات تصور کی جاتی تھی، جنگ جوئی اور سفّا کی بائیں ہاتھ کا کھیل بن گیا تھا، بے جا انتقام اورتعصب کا شمار قومی خصوصیتوں میں ہوتا تھا، ایسے اخلاق سوز اورغیر انسانی ماحول میں اسلام نے جوعمدہ اخلاقی نظام پیش کیا وہ انسانی طبائع کے لیے اکسیر ثابت ہوا اوران کی وجہ سے تہذیب وثقافت سے بے بہرہ قوم عرب میں ایسے اخلاقی نمونے پیدا ہوئے جن کی نظیر انسانی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔

اسلام کا اخلاقی نظام: یوں تو ہر ملک وملت اور عہد وزمانے میں معاشرہ وماحول پر برا اثر ڈالنے والی عادات واطوار کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا گیا ہے؛ بلکہ مذہب اورسماج میں اس کو جرم اورممنوع قرار دیا گیا ہے، چوری وڈاکہ، قتل وخوں ریزی، غیبت وبدگوئی، کینہ وحسد، تکبر، حق تلفی وغیرہ افعال وعادات ہر مذہب وسماج میں مذموم ہیں؛ جب کہ وقار وسنجیدگی، خوش کلامی ونرمی، عدل و

تواضع، امانت و دیانت وغیرہ ہر معاشرے میں اچھے اخلاق شمار کیے جاتے ہیں؛ لیکن اسلام کے اخلاقی نظام اور دیگر اخلاقی قدروں میں کئی اعتبار سے بہت فرق پایا جاتا ہے، اسلام کے علاوہ دیگر نظاموں میں اچھے اور برے اخلاق کا معیار عقل سلیم، پاکیزہ شعور اور تجربہ ہے؛ جب کہ اسلام میں ان سب سے بڑھ کر ایک متعین اتھاریٹی ہے اور وہ ہے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتھاریٹی، اچھا اخلاق وہی ہے جسے اللہ و رسول نے اچھا اخلاق قرار دیا ہو اور اسی طرح برے اخلاق وہ ہیں جسے اللہ و رسول برا کہیں، اسلام میں اچھے اور برے اخلاق کا مسئلہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے، وہ کسی انسانی عقل یا تجربہ کا محتاج نہیں، اسلام نے کسی طرز عمل کو اچھا یا برا اس لیے نہیں کہا کہ اسے لوگ ایسا ہی کہتے اور سمجھتے چلے آئے ہیں؛ بلکہ خود اسے اپنے اصولوں کی بنیاد پر اچھا یا برا کہا ہے، اسلامی اخلاقیات چوں کہ مستقل بنیادوں پر قائم ہیں؛ اس لیے وہ ناقابلِ تغیر اور مستقل ہیں۔

اسلام کا اخلاقی نظام مختلف دائروں میں تقسیم ہے اور اس کی ابتداء انسان کی انفرادی زندگی سے ہوتی ہے، معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے ایک انسان کی اخلاقی ذمہ داری کیا ہے، اسے اسلام نے اپنی جامع اخلاقی تعلیمات میں سمیٹ دیا ہے، جھوٹ و بہتان طرازی، کبر و نخوت، ظلم و ستم، بدسلوکی و بے رحمی، فریب و دھوکہ دہی، شراب نوشی و جوا بازی، زنا کاری و بے حیائی، جنگ و جدال وغیرہ امور کو برائی قرار دیا گیا؛ جب کہ اس کے بالمقابل عمدہ اخلاق کی ہمت افزائی کی گئی، انفرادی دائرہ کے بعد گھریلو سطح پر والدین کے ساتھ حسنِ سلوک و خدمت گزاری کی تعلیم دی گئی، بھائی بہنوں اور رشتہ داروں کے ساتھ احسان و صلہ رحمی، بیوی بچوں کے ساتھ محبت و شفقت کی تعلیم دی گئی، پھر گھریلو سطح سے اٹھ کر معاشرتی سطح پر پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ اور لوگوں کے ساتھ انسانی سلوک اور احترام کا درس دیا گیا، تمام مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی اور تمام انسانوں کے ساتھ ہر حال میں عدل و انصاف، رواداری اور مساوات کا برتاؤ۔

اسلام کے نظامِ اخلاق کا حاصل یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر مرحلہ میں اعلیٰ کردار کو اپنایا جائے، اسلام نے باہمی معاملات کو مطلب پرستی اور خود غرضی نہیں؛ بلکہ ہمدردی و خیر خواہی کے جذبہ سے انجام

دینے کی تعلیم دی، اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی روح ہمدردی وخیر خواہی، عدل وانصاف اور مساوات واحترامِ نفس ہے، اسلام کی خصوصیت یہ ہے اس نے یہ اعلیٰ اخلاقی اصول وضع کیے اور معاشرے میں اسے صدفی صد لاگو کرکے دکھا بھی دیا، اس سلسلے میں اسلام کی آواز اتنی موثر تھی کہ محض قرآن کے اس اعلان سے کہ شراب گندگی اور شیطانی عمل ہے (سورۃ المائدۃ، ۹۰) مدینہ کی گلیوں میں شراب بہنے لگی؛ حالاں کہ نشہ چھڑانا اور وہ بھی شراب کا کتنا مشکل ہے، آج ساری دنیا اس بارے میں پریشان ہے کہ قوم سے نشے کی لت کیسے ختم کی جائے، مگر اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ قرآن نے اسے جڑ سے ختم کردیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی پوری زندگی اسلام کے اسی انقلاب آفریں اخلاقی نظام کا آئینہ ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ ترین اخلاق: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ انسانی میں سب سے اعلیٰ اخلاقی معیار قائم کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدق گوئی اور سچائی کا یہ عالم تھا کہ کفار مکہ کے سردار ابوسفیان کو ہرقل کے دربار میں اس کے اس سوال پر کہ کیا تم نے کبھی محمد سے کچھ جھوٹ سنا ہے، یہ گواہی دینی پڑی کہ نہیں۔ (صحیح بخاری، باب بدء الوحی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت ودیانت کا یہ حال کہ پورا مکہ آپ کا دشمن، آپ کی دعوت سے ان کو انکار؛ لیکن امانتوں کے لیے اگر کوئی محفوظ جگہ تھی جو اسی نبی ہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم کا مکان۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر وتحمل کی انتہا یہ تھی کہ طائف کی خوں چکاں شام اور آپ کا لہولہان جسم، ایسا دن جس کے بارے میں آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ وہ میری زندگی کا سخت ترین دن تھا، اس دن جب پہاڑوں کا فرشتہ اللہ کے حکم سے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر عرض کرتا ہے کہ اگر آپ اجازت دیں تو طائف کے دونوں پہاڑوں کو ٹکرادوں اور یہ گستاخ قوم پس جائے، اس وقت رحمۃ للعالمین کا جواب تھا کہ نہیں، میں اللہ سے امید کرتا ہوں کہ وہ ان کی نسل میں ایسے لوگ پیدا فرمائیں گے جو صرف اللہ کی عبادت کریں گے اور کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔
(صحیح بخاری، باب ذکر الملائکہ)

اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عفو و درگذر اور تواضع و شفقت کا ثبوت دیا، کیا اس کی نظیر کسی تاریخ میں ملنی ممکن ہے؟

غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اعلی ترین اخلاق واوصاف کا ایسا نمونہ ہے کہ اس سے بہتر نمونہ پیش نہیں کیا جا سکتا اور ایسا جامع اخلاقی دستور العمل کہ اس سے بہتر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمدہ اخلاق کا فیضان تھا کہ آپ کی دعوت نہایت تیزی کے ساتھ عربوں میں پھیلتی چلی گئی، آپ اپنے بلند انسانی کردار سے دشمن کے دل کو فتح کر لیتے اور اس کی روح کو اسیر کر لیتے۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ ایک مہم کے دوران صحابہ نے یمامہ کے سردار ثُمامہ ابن اُثال کو زندہ پکڑ لیا اور خدمتِ اقدس میں پیش کیا، آپ نے ان کا حال پوچھا تو انھوں نے کہا : اگر آپ چاہیں تو قتل کر دیں، اگر آپ معاف کر دیں تو آپ کا احسان مند ہوں گا اور اگر مال کی خواہش ہے تو وہ بھی پیش کر دوں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بالآخر رہا کر دیا؛ جب کہ دشمنوں کے سردار کو رہا کرنے کا تصور بڑا ہی عجیب تھا؛ مگر ہوتا کیا ہے کہ وہی شخص جس کو آپ قید سے نکال رہے ہیں، وہ بخوشی آپ کی غلامی میں آرہا ہے؛ چناں چہ ثمامہ ایک قریبی باغ میں جا کر غسل کرنے کے بعد دوبارہ واپس آتے ہیں اور اپنے اسلام کا اعلان کرتے ہیں۔(مسلم، حدیث ۳۳۱۰)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی ایسے بے شمار واقعات سے بھری ہوئی ہے۔

صحابہ کرامؓ، اخلاق وانسانیت کے مکمل پیکر

اسلام کی معجزاتی تاثیر نے ہی اخلاق واقدار سے بیگانہ عرب قوم کو تہذیب اور اعلی اخلاق کا آئیڈیل بنا دیا، درس گاہِ قرآنی کے اولین فضلاء یعنی صحابہ کرامؓ دین واخلاق اور سیاست وقوت کے مکمل

پیکر تھے، ان میں انسانیت کی اپنے تمام گوشوں، شعبوں اور محاسن کے ساتھ نمود تھی، ان کی اعلیٰ روحانی تربیت، بے مثال اعتدال، غیر معمولی جامعیت اور وسیع عقل کی بنا پر ان کے لیے ممکن ہوا کہ وہ انسانی گروہ کی بہتر طور پر اخلاقی اور روحانی قیادت کرسکیں، ان کے اعلیٰ اخلاقی نمونے معیار کا کام دیتے تھے اور ان کی اخلاقی تعلیمات عام زندگی اور نظامِ حکومت کے لیے میزان کا درجہ رکھتی تھیں، ان میں فرد و جماعت کا تعلق حیرت انگیز طور پر رواداری اور برادرانہ تھا، وہ ایک معیاری دور تھا، جس میں عدل و انصاف، صدق و سادگی، خلوص و وفا اور محبت و الفت کی خوشگوار ہوائیں چلتی تھیں، اس سے زیادہ ترقی یافتہ دور کا انسان خواب نہیں دیکھ سکتا اور اس سے زیادہ مبارک و پر بہار زمانہ فرض نہیں کیا جا سکتا۔

اطاعت و فرماں برداری اور خلوص و بے نفسی کی عظیم ترین مثال حضرت خالد بن ولیدؓ کے واقعہ میں ملتی ہے۔

آپ بے حد بہادر اور غیر معمولی فوجی قابلیت والے شخص تھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت تک مسلسل اسلامی فوج کے کمانڈر رہے؛ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کے سلسلے میں کچھ شکایتیں تھیں؛ اس لیے اپنے زمانۂ خلافت میں حضرت خالدؓ کو سرداری سے معزول کر کے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت دے دی، اس وقت وہ شام کے علاقہ میں فتوحات کے شاندار کارنامے دکھا رہے تھے۔ عین یرموک کی لڑائی میں جسے تقریباً حضرت خالدؓ اپنی سربراہی میں سر کر چکے تھے، اسی وقت خلیفۂ وقت نے انھیں معزول کر کے حضرت ابوعبیدۃ بن الجراح کو لشکر اسلامی کا سردار بنا دیا، فتح یرموک کے بعد فوجیوں کی ایک تعداد آپ کے پاس جمع ہوئی اور اس حکم کی مخالفت کی بات کی؛ لیکن انھوں نے ایسے ہر مشورہ کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا اور حضرت ابوعبیدہؓ کی ماتحتی میں ایک معمولی فوجی کی حیثیت سے لڑنے کو ترجیح دی اور ایک تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: اِنِّيْ لاَ أُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ عُمَرَ وَلٰكِنْ فِيْ سَبِيْلِ رَبِّ عُمَرَ (میں عمر کی راہ میں جنگ نہیں لڑتا؛ بلکہ عمر کے رب کی راہ میں لڑتا ہوں)۔

اموی حکومت کے بانی حضرت معاویہؓ اور رومی حکومت کے درمیان ایک میعادی معاہدہ تھا، حضرت معاویہؓ اپنی فوج لے کر دشمنوں کی سرحد سے قریب اس نیت سے پہنچ گئے کہ معاہدہ کی مدت

پوری ہوتے ہی ان پر اچانک حملہ بول دیں گے، اس صورت میں اچانک حملہ کے مقابلہ میں دشمن تیار نہ ہوگا اور یقینی طور پر شکست کھا جائے گا، ابھی حضرت معاویہ سرحد پر پہنچے ہی تھے کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار ظاہر ہوا اور زور زور سے کہنے لگا : اللہ اکبر، اللہ اکبر، وفاءٌ لا غَدَرَ (اللہ اکبر، وعدہ کی پاس داری کرو، اسے توڑو نہیں)۔ لوگوں نے دیکھا کہ یہ صحابی رسول حضرت عمرو بن عنبسہ تھے، حضرت معاویہ نے انھیں اپنے خیمہ میں بلایا اور مطلب پوچھا، تو انھوں نے حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیان کی کہ جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو تو وہ اس کی کوئی گرہ باندھے اور نہ کوئی کھولے؛ یہاں تک کہ مدت پوری ہوجائے، حضرت معاویہ اس حدیث کو سن کر اپنے اقدام سے باز آگئے اور اپنی فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔ (تفسیر ابن کثیر)

احد کی لڑائی میں عین اس وقت جب کہ قتل وخون کا معرکہ گرم تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار ہاتھ میں لی اور فرمایا کون اس تلوار کو اس کے حق کے ساتھ لے گا۔ حضرت ابو دجانہ سامنے آئے اور پوچھا: یا رسول اللہ! اس تلوار کا حق کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اس سے دشمنوں کو مارو یہاں تک کہ اس کو ٹیڑھا کردو، حضرت ابو دجانہ نے کہا کہ میں اس کو اس کے حق کے ساتھ لیتا ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تلوار عنایت فرمادی۔ حضرت ابو دجانہ اس تلوار کو لے کر اکڑتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسی چال خدا کو پسند نہیں سوائے ایسے موقعوں کے، پھر کیا تھا وہ انتہائی بہادری کے ساتھ لڑنے لگے، جو بھی ان کے سامنے آتا، وہ ان کی تلوار کا نشانہ بن جاتا، اسی درمیان اچانک کیا ہوتا ہے کہ ان کی نظر ایک شخص پر پڑتی ہے جو لوگوں کو جنگ پر ابھار رہا تھا وہ اس کی طرف لپکے اور اپنی تلوار اس کے سر پر اٹھالی، اتنے میں وہ چیخا یَا وَیْلَاہ۔ تو حضرت ابو دجانہ کو محسوس ہوا کہ یہ کوئی عورت (ہند بن عتبہ زوجہ ابوسفیان) ہے، یہ ذہن میں آتے ہی انھوں نے تلوار ہٹالی، جذبات پر قابو پانے اور انتہائی جذباتی حالات میں بھی نفسانی فیصلہ نہ کرنے کی یہ عمدہ ترین مثال ہے۔ (سیرت ابن ہشام، ۲:۶۸)

دنیا سے بیزاری اور آخرت سے محبت صحابہ کرام میں اس قدر پیوست تھی کہ وہ دنیا کے مال واسباب کو اللہ کے راستے میں بے خطر لٹا دیا کرتے تھے اور یہ پورا پورا اثاثہ اللہ کے

راستے میں دینا ان کے نزدیک معمولی چیز تھی۔

جنگ یرموک میں حضرات صحابہ کا جذبۂ ایثار و ہمدردی بھی ایک مشہور واقعہ ہے جس میں میدان جنگ میں جان بلب ایک صحابی کو پانی پیش کیا جاتا ہے، اتنے میں انھیں قریب سے کراہنے کی آواز آتی ہے، وہ انھیں پانی پیش کرنے کو کہتے ہیں، پانی پلانے والا ان کے پاس پہنچتا ہے کہ انھیں بھی کسی کے کراہنے کی آواز آتی ہے وہ بھی پہلے انھیں پانی پلانے کو کہتے ہیں، جب پانی پلانے والا ان کے پاس پہنچتا ہے تب تک ان کی سانس بند ہو چکی ہوتی ہے اور جب لوٹ کر پچھلے صحابہ کے پاس پہنچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بھی روح قبض ہو گئی۔

حضراتِ صحابہؓ کی زندگی ایسے واقعات سے لبریز ہے، جس میں ہمیں نہایت اعلیٰ درجہ کے اخلاقی نمونے ملیں گے، اسلام نے اخلاقی تعلیمات کا ایسا جامع نظامِ عمل مرتب کیا اور صحابہؓ نے اس کو اپنی زندگی میں اس طرح نافذ کیا کہ جس نے انسانی معاشرے میں اخلاقی قدروں میں انقلاب برپا کر دیا۔

اسلام کی یہی اخلاقی تعلیمات بعد کے زمانے میں بھی اسلام کی اشاعت میں زبردست طور پر موثر ہوئیں، کتنے ہی ممالک اور علاقے ایسے ہیں جہاں کسی مسلم فوج کشی کی کوئی تاریخ نہیں؛ مگر پورا کا پورا علاقہ اسلام کے نام لیواؤں سے بھرا ہوا ہے، آج دنیا میں سب سے بڑی مسلم آبادی والا ملک انڈونیشیا اور ملیشیا میں اسلام کے نام لیواؤں کا وجود، نیز یورپ، امریکہ و آسٹریلیا وغیرہ میں اسلام کی روز بروز ترقی دراصل اسلام کی انقلابی اخلاقی تعلیمات کا ہی کرشمہ ہے۔

اسلام کے نظام اخلاق کے بدولت کتنے دلوں کی کایا پلٹی اور کتنے ہی علاقوں میں اسلام کا بول بالا ہوا؛ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں جو چند ظاہری اسباب ہیں، ان میں اسلام کا نظامِ اخلاق ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ

روحانیت و مادّیت کا بنیادی فرق

مولانا محمد معاویہ سعدی استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہرعلوم سہارنپور

۳- رُوحانیت ونفسانیت کا فرق :

کتاب وسنت میں ''روح'' اور ''نفس'' کے اَلفاظ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے، یہ دونوں جواہر اوراَجسام کی قبیل سے ہیں، یا اَعراض اوراَحوال کی قبیل سے، پھر دونوں کی حقیقت ایک ہی ہے، یا الگ الگ، یا روح متشابہات میں سے ہے، اور نفس اُس سے الگ کوئی مستقل وجود ہے؟ مفسرین ومحققین کے ہاں یہ سب (اوران کے علاوہ بہت سے) اَقوال پائے جاتے ہیں، کتاب وسنت میں اِن دونوں کی حقیقت سے متعلق جو کچھ وارِد ہوا ہے وہ یا صریح نہیں ہے، یا سنداً اِتنا صحیح نہیں ہے، کہ اُس کی بنیاد پر کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکے۔

اِس وقت میرا موضوع: اِس مسئلے کی علمی تحقیق اور محاکمہ کے بجائے؛ ایک مسلمان کو ہر عمل میں روحانیت ونفسانیت کا جو فرق ملحوظ رکھنے کا شرعی حکم ہے، اپنے اکابر کے کلام کی روشنی میں بتوفیقہ تعالیٰ اُس کو ذرا وضاحت سے بیان کرنا ہے- **فإن كان صواباً فمن مواهب الرحمن، وإن كان خطأ فمن النفس والشيطان، ونعوذ بالله من الخذلان-:**

روح کی دو قسمیں ہیں :

(۱) ایک نورانی اورغیر مادّ ی، اس کوعُلوی بھی کہتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ اَمر کا مظہر اور بعض حضرات کے نزدیک {**ونفخت فيه من روحي**} [**الحجر : ۲۹**] کی ایک تفسیر ہے۔

روحِ علوی: نورانی اورغیر مادّ ی ہونے کی وجہ سے بلندی کی طرف پرواز کرتی ہے، عالمِ بالا (آخرت) سے مناسبت کی وجہ سے وہ ایسے کام کرنا چاہتی ہے جو عالمِ بالا میں اُس کی ترقی، اورقربِ خداوندی کا ذریعہ بنیں، وہ کہیں بھی رہے اُس کو فکر وہیں کی ہوتی ہے، حتی کہ وہ عالمِ سفلی

(دنیا) کا کام بھی دینی اُصول اور آخرت ہی کے اَجر و نفع کے خیال سے انجام دیتی ہیں، روحِ علوی ہی اِنسان کی وہ قوتِ محرِّکہ (ابھارنے والی) بھی ہے جو اُس کو اُس کے وطن اَصلی (عالم بالا/آخرت) کی یاد دِلاتی، اور وہاں کے نفع ونقصان کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

ہماری اصطلاح میں جب مطلق ''روح'' بولا جاتا ہے تو یہی مراد ہوتی ہے، اِنسان کی ''فطرت'' میں یہی روح داخل ہے: {فطرة الله التي فطر الناس عليها} [الروم : ۳۰] (اللہ کی بنائی ہوئی یہی وہ فطرت ہے جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا فرمایا ہے)۔ حدیث شریف میں ہے: ما من مولود إلا يولد على الفطرة، فأبواه يُهوِّدانه أو يُنصِّرانه أو يُمجِّسانه [بخاری :۱۳۵۸، ومسلم :۲۶۵۸] (ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اُس کے والدین اُس کو یہودیت، نصرانیت، اور مجوسیت وغیرہ گمراہ راستوں پر ڈال دیتے ہیں)۔

روح علوی کی غذا: چونکہ روح کا مرکز اَصلی عالمِ بالا ہے، اِس لیے روح کی غذا بھی وہیں سے وابستہ ہے، اِیمان، اور معرفتِ رب اُس کی بنیادی غذا ہے، پھر دیگر عبادت، طاعت، ذکر، تلاوت، دعا، مناجات وغیرہ نورانی اَعمال سے اُس کے اندر مزید قوت، فرحت اور ترقی پیدا ہوتی ہے، قرآن کریم میں ہے: {ألا بذكر الله تطمئن القلوب} [الرعد :۲۸] (سن لو! اللہ کے ذکر ہی سے قلوب کو طمانینت اور تسلی حاصل ہوتی ہے)۔

روح علوی کے لیے مقوی: روح کی حفاظت، قوت اور ترقی میں بنیادی غذا کے اہتمام کے بعد، سب سے زیادہ مؤثر چیز: مخالفِ نفس اُمور پر صبر ومجاہدہ، اور خلافِ شرع اُمور سے تقوی و پرہیز اِختیار کرنا ہے، کیوں کہ یہ اُصول طے شدہ ہے کہ جس کی روح جتنی طاقتور ہوتی ہے، اُس کا نفس اتنا ہی کمزور، اور جس کا نفس جتنا قوی ہوتا ہے، اُس کی روح اتنی ہی ضعیف۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اِیمان والوں سے روحِ علوی کی ہی قوت اور ترقی مطلوب بھی ہے، جیسا کہ: {سابقوا إلى مغفرة من ربكم وجنة...} [الحدید: ۲۱]، اور {وسارِعوا إلى مغفرة من ربكم وجنة...} [آل عمران: ۱۳۳]، اور {وفي ذلك فليتنافس المتنافسون} [المطففين: ۲۶]، اور

{لمثل ھذا فلیعمل العاملون}[والصافات : ۶۱] جیسی آیات سے ظاہر ہے۔

کسی بھی عمل کے شریعت کے نزدیک روحانی ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں:

۱– ایک یہ کہ وہ عمل شریعت میں (فرض، واجب، سنت، مستحب، مندوب) کسی درجے میں بھی مطلوب ہونا چاہیے، یا کم از کم ایسا مباح ہونا چاہیے کہ اُس میں مشغول ہونے سے اُس سے اَہم کسی اور مطلوبِ شرعی میں خلل اور رخنہ نہ پڑے، اور اُس کے کرنے سے کسی گناہ کا اِرتکاب بھی لازم نہ آئے، اور نہ ہی کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو؛ اِلا یہ کہ شرعی مجبوری کی صورت ہو۔

۲– دوسری شرط یہ ہے کہ اُس عمل کو خالص اللہ کی خوشنودی کی خاطر اَنجام دیا جائے، مخلوق کو دِکھانا، سنانا، یا کوئی مال، عہدہ، اور شہرت وغیرہ حاصل کرنا مقصود نہ ہو۔

حاصل یہ کہ روحانیت اور نفسانیت میں فکرِ آخرت کے اِستحضار وعدمِ استحضار کا فرق اہم ہے، جو کام اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی نیت سے کیا جائے، اور اُس کے لیے طریقہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِختیار کیا جائے، تو یہ ''روحانیت'' ہے، خواہ وہ کام نماز روزہ وغیرہ عبادات کا ہو، یا خرید وفروخت وغیرہ معاملات کا ہو، یا حکومت وسلطنت وغیرہ سیاسیات کا ہو۔

اور اگر اِخلاص اور اتباعِ شریعت میں سے کوئی بھی قید رَہ جائے تو وہ اِقدام ''نفسانیت'' بن جاتا ہے، چاہے وہ دیکھنے میں جتنا بھی دِینی اور اسلامی محسوس ہو، اور یہ معلوم ہے کہ نفسانی چیزوں کا اللہ کے ہاں کوئی وزن نہیں، وہاں صرف روحانی اور نورانی اَعمال ہی کا وزن ہوگا۔

فسادِ نیت اور فسادِ عمل کا فرق: اگر کوئی شخص کوئی عمل ظاہری طور پر اِسلامی طریقے کے مطابق اَنجام دے، مگر فسادِ نیت کی خرابی بھی اُس میں شامل کردے، تو اگرچہ یہ غلطی ہے، مگر پھر بھی یہ اُس شخص کے مقابلے میں اَہون (یا اَحسن) ہے جو ظاہری اعتبار سے بھی کام کو غیر اِسلامی اور غیر شرعی طریقے پر انجام دے رہا ہے، اِس لیے کہ صحیح راستہ اِختیار کرنے کے بعد صرف فسادِ نیت کی غلطی تو ایسی ہے جیسے کوئی شخص منع کیے جانے کے باوجود راستہ چلتے اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے، جو کہ کمالِ ادب اور وحدتِ مطلب کے خلاف ہے۔

جب کہ کوئی غیر اِسلامی عمل یا طریقہ اِختیار کرنا، اور پھر نیت کے ذریعے اُس کو اِسلامی بنانے کی کوشش کرنا، یہ اللہ رب العزۃ کی شان میں سخت گستاخی اور بے ادبی ہے، کہ زبردستی ایسے راستے سے اُس تک پہنچنے کی کوشش کی جارہی ہے جس پر چلنے پر اُس نے پابندی لگارکھی ہے: {و من يبتغ غير الإسلام دِيناً فلن يقبل منه، وهو في الآخرة من الخاسرين}۔ اِس آیت میں لفظِ ''دین'' عام ہے، عبادت و بندگی کے اُصولی و فروعی تمام اُمور اِس میں داخل ہیں، اِسی لیے اسلامی تعلیمات اور شرعی اصولوں کی روشنی میں ''جدت پسندی'' بدعت ہی کی ایک قسم ہے۔

(۲) روح کی دوسری قسم کثیف اور مادّی ہوتی ہے، جس کو سفلی بھی کہا جاتا ہے، یہ عناصرِ اَربعہ: مٹی، ہوا، آگ، اور پانی کے اِجتماع سے اٹھنے والے بخارات اور نمی سے بحکم خداوندی پیدا ہوتی ہے، رحمِ مادر میں بچے کے اندر ڈالی جانے والی روح یہی ہے۔

روحِ سفلی: کثیف اور مادّی ہونے کی بنا پر نیچے کی طرف جاتی ہے، ایسے اُمور کی طرف متوجہ ہوتی ہے جو پستی کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں، وہ کوئی بھی کام کرے اُس کی پرواز عالمِ بالا تک ہو ہی نہیں پاتی، اُس کا تخیّل بہت محدود اور دائرۂ عمل انتہائی تنگ ہوتا ہے، حتی کہ وہ عالمِ بالا (دِین) کا کام بھی کسی مادّی اور سفلی نفع کے پیش نظر ہی کرتی ہے، اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں اِرشاد فرماتے ہیں: {ولو شئنا لرفعناه بها ولكنه أخلد إلى الأرض واتبع هواه...}[الأعراف:۱۷۶] (اور اگر ہم چاہتے تو اُس کو اِن آیات (اور علم) کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے، لیکن وہ خود ہی زمین (کی پستی اور دنیا) کا ہو رہا، اور اپنی خواہشات کی پیروی کی...)۔

روحِ سفلی کی غذا: روحِ علوی کے برعکس، روحِ سفلی کی غذا: مٹی سے اُگی ہوئی، آگ سے پکی ہوئی، پانی سے نمو پائی ہوئی، اور ہوا میں پلی ہوئی مادّی چیزوں سے حاصل ہوتی ہے: کھانا، پانی، خوش نما مناظر، تفریحی ماحول، جسم کے لیے راحت و آرام کے اسباب وغیرہ چیزوں سے نفس کو قوت، فرحت، اور لذت ملتی ہے۔

اگر یہ سب شریعت کی طرف سے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق، اور مقررہ کردہ حدود

کے اندر ہوں تو فی الجملہ مطلوب ہیں، حدیث شریف میں ہے: **إن لنفسک علیک حقاً** [**بخاری: ۱۱۵۳، مسلم: ۱۱۵۹**] (بے شک تمھارے نفس کا بھی تم پر حق ہے)۔ اور اگر شرعی اُصول کے خلاف، یا طبعی ضرورت سے زائد نفسانی جذبات پیدا ہوں تو یہ ہوائے نفس، شہوت، اور خواہشات کہلاتے ہیں، اور ان کی تکمیل کی زیادہ فکر اِیمان والوں کے لیے مضر ہے: {**ولا تتبع الهوى فيضلك عن سبيل الله**} [ص: ۲۶] (اور خواہشات کی پیروی نہ کیا کرو، یہ تمھیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی)۔

نفس: یہ روحِ سفلی ہی کا دوسرا نام ہے، یا اُس سے الگ کوئی شئ ہے؛ دونوں ہی اِحتمال ہے، البتہ اتنی بات بہر حال ہے کہ اَخلاقِ ذمیمہ اور اوصافِ رذیلہ کا سر چشمہ ''نفس'' ہی ہوتا ہے، اِسی لیے اُس کے تزکیہ کی اتنی تاکید اور اہمیت وارد ہوئی ہے۔

پھر مختلف اَحوال کے اعتبار سے روحِ سفلی (یا نفس) کی تین قسمیں ہیں:

۱— اَمّارہ: اُس روحِ سفلی (اور نفس) کو کہتے ہیں جو اپنی اَصل یعنی روحِ علوی سے بالکل ہی باغی اور بیزار ہو، جو ہوائے نفسانی کے اِغواء کا اِس طرح شکار ہو گئی ہو کہ اُس کو عالمِ بالا سے ذرا بھی مناسبت نہ رہ گئی ہو، ہمیشہ سفلی خواہشات ہی میں گرفتار رہتی ہو: {**إن النفس لأمارة بالسوء**} [**یوسف: ۵۳**]۔ اِس میں مختلف درجات اور مراتب بھی ہیں۔

۲— لوّامہ: اُس روح (یا نفس) کو کہتے ہیں جس سے اگرچہ عملی طور پر تو کچھ سفلی اَعمال و اَشغال صادر ہو جاتے ہوں، مگر فکر و عقیدہ کے اعتبار سے وہ اپنی اَصل اور مرکزِ حقیقی ہی سے وابستہ ہو، اور اُسی کو اپنے لیے جائے پناہ اور محلِ سکون تسلیم کرتی ہو۔

تو ایسی روح ایک عجیب بے چینی اور اضطراب میں رہتی ہے، چونکہ اُس کو اپنا اَصل مقام (عالم بالا) معلوم ہے، اور اُس کی طرف فطری کشش ہے، اِس لیے اُدھر جانا بھی چاہتی ہے، لیکن موانع اور شواغل حائل ہوتے رہتے ہیں، اِس لیے یہ اندر ہی اندر کڑھتی اور تڑپتی بھی رہتی ہے، اور خود کو ملامت کرتی رہتی ہے، حدیث شریف میں اِس کو اِیمان کی علامت قرار دیا گیا ہے: **إذا ساءَتْک**

سیئتک، وسرتک حسنتک فأنت مؤمن [مسند احمد ۵/۲۵۲]۔

۳۔مطمئنّہ: اُس روح (نفس) کو کہتے ہیں جو اپنے غالبِ اَحوال میں اپنے مرکز اصلی سے مربوط اور وابستہ رہتی ہے، یہ ہمہ وقت نشاط، بشاشت اور طمانینت کی کیفیت سے سرشار رہتی ہے۔ اِس میں بھی انبیائے کرام علیہم السلام، صحابہؓ، صدیقینؒ واولیاءؒ وغیرہ کے لحاظ سے مختلف درجات اور مراتب ہوتے ہیں۔

طبیعت: روحِ سفلی ہی وہ قوتِ محرّکہ بھی ہے جو اِنسان کو عالمِ سفلی (دنیا) کی فکر، اور اُس کے نفع ونقصان کی طرف متوجہ کرتی رہتی ہے، یہی وہ ''طبیعت'' بھی ہے جس سے بعض مرتبہ ''فطرت'' کا اِلتباس ہوجاتا ہے، حالاں کہ اِنسان کی فطرت علوی ہے، جب کہ طبیعت سفلی ہے، الا یہ کہ وہ فطرت کے مطابق ہوجائے، جیسے انبیائے کرام علیہم السلام کی طبیعتیں۔

جذبات: روح اور نفس کی قوتِ محرّکہ کو ''جذبات'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، جو جذبات اُخروی نفع (اور رضائے خداوندی) کے استحضار کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اُن کو ''روحانی'' کہا جاتا ہے، اِیمان والوں سے یہی مطلوب ہیں: {تریدون عَرَض الدنیا، واللہ یرید الآخرۃ} [الأنفال :۶۷] (تم دنیا کا مال اَسباب چاہتے ہو، حالاں کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے آخرت کا اَجر وثواب چاہتے ہیں)۔ اور جو جذبات، آخرت سے قطعِ نظر، صرف دنیا ہی کے فائدہ ونقصان کے تعلق سے ہوتے ہیں اُن کو ''نفسانی'' کہتے ہیں۔

قلب: کسی بھی باہوش وحواس اِنسان سے صادر ہونے والا ہر قول وعمل (روحانی یا نفسانی) جذبات ہی سے ناشی ہوتا ہے، اور اِن تمام جذبات کا محل ''قلب'' ہے، جس کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ جب وہ ٹھیک رہتا ہے تو دیگر تمام اعضاء درست رہتے ہیں، اور جب وہ بگڑتا ہے تو دیگر اعضا بھی خراب ہوجاتے ہیں: ألا إن في الجسد مضغةً، إذا صَلَحت صلَحَ الجسدُ کله، وإذا فسَدَت فسَدَ الجسد کله، ألا وهي القلب [بخاری :۵۲، مسلم :۱۵۹۹]۔ اِس لیے روحِ علوی کی حفاظت اور ترقی کے لیے قلب کی اِصلاح کی فکر بہت اہم ہے، تطہیر قلب صوفیائے

کرام کا خاص موضوع ہے۔

امید کہ مذکورہ بالا تفصیلات سے شرعی اعتبار سے روحانیت اور نفسانیت کا فرق واضح ہو گیا ہوگا، اور یہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ جو کام فکر آخرت کے جذبات کے ساتھ، اُصولِ شریعت کے مطابق اَنجام پاتا ہے وہی ''روحانی'' کہلاتا ہے، اُسی پر آخرت کے اَجر وثواب کا وعدہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور ہر اِیمان والے کو علم نافع، عمل صالح، اور خلوص وللّٰہیت، کے ساتھ دِین وشریعت پر اِستقامت عطا فرمائیں، اور دنیا کو محورِ فکر اور مبلغِ علم بنانے کے بجائے، آخرت کو مقصود بنانے کی توفیق اَرزانی فرمائیں۔ آمین (باقی آئندہ ان شاء اللہ)

مظاہر علوم سہارنپور میں

مجلس انعامی

انشاء اللہ امسال بھی طلبہ کو انعامات تقسیم کرنے کے لئے ۲۷/ رجب ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۴/ اپریل ۲۰۱۸ء بروز شنبہ صبح سات بجے فوقانی زکریا منزل میں مجلس انعامی منعقد ہوگی، انعام حاصل کرنے والے تمام طلبہ کا حاضر رہنا ضروری ہے، مجلس سے غیر حاضر ہونے والے طالب علم کو انعام نہیں دیا جائے گا۔

جو طلبہ دورۂ حدیث شریف یا دیگر شعبہ جات سے فارغ ہو چکے ہیں وہ اپنی آمد کی اطلاع پہلے ہی دفتر میں کر دیں تا کہ ان کا انعام بروقت تیار کرلیا جائے۔

شائع کردہ

دفتر تعلیمات مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

مسلمانوں کی معاشی پسماندگی

اسباب اور تدارک

مولانا محمد اسرار الحق قاسمی

انسانی زندگی میں معیشت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، معاشی استحکام کے بغیر نہ فرد ترقی یافتہ خیال کیا جاتا ہے اور نہ قوم، قدم قدم پر انسان کو مال اور پیسے کے ضرورت پڑتی ہے، معاش کی یہ اہمیت ہر دور میں رہی ہے، لیکن عہد حاضر میں معاشی استحکام گزشتہ زمانوں کے مقابلے میں اور زیادہ ناگزیر نظر آرہا ہے، کیونکہ اس زمانے میں اخلاق وروحانیت کا دائرہ محدود ہوا ہے اور مادیت نے ہر چہار جانب اپنی حکمرانی قائم کرلی ہے، ہر شخص پُر تعیش زندگی گزارنے کا خواہاں ہے، اس کے لیے بہت سے لوگ تگ ودو بھی کررہے ہیں، وہ الگ بات ہے کہ کس کی کوششیں کتنی کامیاب ہیں اور کون اپنے اہداف کو کس حد تک پارہا ہے۔

دولت کی بڑھتی خواہش اور دولت کے حصول کے نت نئے طریقوں نے انسان کو بہت زیادہ مفاد پرست بھی بنادیا ہے، اسی لیے اپنے مفادات کے لیے لوگ دوسروں کا استحصال کرنے یا دوسروں کو نقصان پہنچانے تک سے گریز نہیں کررہے ہیں، ایسے میں لوگوں سے بھلائی کی توقعات وامکانات کم ہوگئے ہیں، اگر انسان کے پاس پیسہ ہے تو اس کی ضروریات پوری ہورہی ہیں، لیکن اگر پیسہ نہیں ہے تو اس کی زندگی نہایت کسمپرسی میں گزررہی ہے، لوگ تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں یا معاشی اعتبار سے کمزور افراد اور طبقات کو آگے بڑھانے کے جذبے سے محروم ہوگئے ہیں، اس لیے اس دور میں ضروری ہے کہ فرد بھی معاشی لحاظ سے مستحکم ہو اور قوم بھی اقتصادی طور پر مضبوط ہو۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبے پر زور دیتا ہے اور کسی کو بھی تشنہ لب نہیں چھوڑتا، چونکہ معاشیات انسانی زندگی کا اہم شعبہ ہے، اس لیے اس بابت اسلام نے روشنی پیش کی ہے تا کہ اس میں چل کر لوگ اپنی معاشی زندگی کو بہتر بنا سکیں۔

معاشیات کی طرف اسلام شروع سے ہی توجہ دیتا ہے، کیونکہ اسلام میں معاشرتی زندگی بہت اہم ہے، اسلامی تعلیمات کے مطابق انسان کو سماج میں ہی رہنا ہے، شادی بھی کرنی ہے، بیوی کے اخراجات بھی اٹھانے ہیں، بچوں کی پرورش و پرداخت بھی کرنی ہے، ماں باپ کے حقوق اور سماج کے کمزور طبقات کی ضرورتوں کو بھی پورا کرنے میں حصہ لینا ہے ظاہر ہے کہ ان سب تقاضوں کی تکمیل کے لیے مال ودولت کے کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اسلام میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ کوئی جنگلوں اور پہاڑوں کا رخ کرلے اور سماج ومعاشرت سے کٹ جائے، اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اگر کوئی محنت ومشقت کر کے کچھ کماتا ہے تو یہ بڑی سعادت کی بات ہے، اسلام ایسے لوگوں کو سراہتا ہے، ان کی ہمت افزائی کرتا ہے۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دعا دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ **اللھم اکثر مالہ** اے اللہ ان کو مالِ فراواں دے، ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مال اگر صحیح طریقے سے حاصل ہو اور اسے صحیح جگہ پر استعمال کیا جائے تو برا نہیں ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہ اجمعین میں کئی صحابی ایسے گزرے ہیں جو آج کے ارب پتیوں سے کم نہیں تھے، جیسا کہ حضرت عثمان غنی، حضرت عبدالرحمن بن عوف، زبیر بن العوام اور طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہم۔

اسلامی تعلیمات کے مطالعہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو پیسے کمانے سے نہیں روکتا ہے، بلکہ اگر کوئی اپنے بیوی بچوں کے اخراجات کی تکمیل کے لیے اور اپنے گھر بار کو درست طور پر چلانے کے لیے کاروبار وتجارت کرتا ہے تو اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کی، آپ کے صحابہ نے بھی تجارت کی ہے، بعض اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کھیتوں میں بھی کام کرتے تھے اور بازاروں میں بھی خرید وفروخت

کرتے تھے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ وہ خود تو اصحابِ صفہ میں سے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فیضیاب ہوتے تھے لیکن مہاجرین بازاروں میں مشغول اور انصار کھیتوں میں کام کرتے تھے، صحابہ کرام نے صرف تجارت میں حصہ ہی نہیں لیا بلکہ تجارت کو الگ انداز میں فروغ بھی دیا، مندرجہ ذیل واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کاروبار میں کس قدر برکت ہے اور اسلام نے کاروبار و تجارت کی کس طرح حوصلہ افزائی کی ہے۔

انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک انصاری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی بے کاری کی شکایت کی، آپ نے فرمایا: کیا تیرے گھر میں کچھ نہیں؟ اس نے عرض کیا، کیوں نہیں، ایک چادر ہے، جسے ہم اوپر اوڑھتے ہیں اور نیچے بچھاتے ہیں اور ایک پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں، آپ نے فرمایا: جاؤ وہ دونوں چیزیں لے آؤ، جب وہ شخص دونوں چیزیں لے آیا تو آپ نے انھیں لے کر حاضرینِ مجلس سے مخاطب ہوکر فرمایا: دونوں چیزوں کو کون خریدے گا؟ ایک آدمی نے کہا: میں ایک درہم میں خریدتا ہوں، آپ نے فرمایا: دو یا تین درہم میں کون خریدے گا؟ ایک دوسرے آدمی نے کہا: میں دو درہم میں خریدتا ہوں، آپ نے پلان اور پیالہ آدمی کو دے کر دو درہم لے لیے، انصاری کو دے کر فرمایا: ایک درہم کا کھانا خرید کر اپنے گھر والوں کو دے آؤ اور دوسرے درہم کی ایک کلہاڑی خرید کر میرے پاس لے آؤ، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دستِ مبارک سے دستہ لگایا اور فرمایا: یہ کلہاڑی لے کر جاؤ اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لایا کرو اور انھیں بیچا کرو اور پندرہ دن تک میرے پاس مت آنا۔

وہ شخص چلا گیا اور لکڑیاں کاٹ کر فروخت کرتا رہا، جب پندرہ دن کے بعد آیا تو وہ دس درہم کما چکا تھا، جن میں سے کچھ درہم کا اس نے کپڑا اور کھانا خریدا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: یوں کما کر کھانا تمھارے لیے بہتر ہے اس سے کہ لوگوں سے مانگتے پھرو، اور اس کے سبب قیامت کے روز تمہارا چہرہ داغ دار ہو۔

اسلام نے تجارت کے لیے اصول وضوابط بیان کیے اور تجارت کے باب میں

اصلاحات کیں تاکہ تجارت کا عمل صاف ستھرے انداز میں کیا جائے، اس سے تاجر کا بھی فائدہ ہو اور دوسرے لوگوں کا بھی، اسلام میں ایسی تجارت کے لیے گنجائش نہیں ملتی جس کے ذریعہ تاجر تو خوشحال ہو، اور دوسرے لوگوں کا تاجر کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے نقصان ہو، تجارت کو باضابطہ فروغ دینے اور اسے بہترین سانچے میں ڈھالنے کے لیے عملاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدِ نبوی کی تعمیر کے بعد ''سوق المدینہ'' قائم کیا۔

معلوم یہ ہوا کہ اسلام معیشت واقتصادیات کو نظر انداز نہیں کرتا ہے بلکہ معیشت واقتصادیات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اپنے ماننے والوں کی اس سلسلے میں رہنمائی بھی کرتا ہے کہ انھیں کس طرح اپنی معیشت کو مضبوط کرنا ہے، اسلام نے جو طریقے معیشت واقتصادیات کے لیے بیان کیے ہیں، وہ نفع بخش اور عوام الناس کے لیے مفید ہیں، اسلام کے بیان کردہ ضابطے انسان کے حسن اخلاق کو بھی متاثر نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی تہذیبی ومذہبی زندگی کو نقصان پہنچاتے ہیں، جب کہ دنیا میں رائج معیشت کے دوسرے بہت سے نظام ونظریات سے انسانی زندگی کو اتنا فائدہ پہنچتا نظر نہیں آتا ہے اور وہ کسی نہ کسی حد تک انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں کو متاثر کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج جب کہ تمام قومیں اور افراد اپنی معیشت کو مضبوط کرنے میں مصروف ہیں، انسانی زندگی متاثر ہو رہی ہے اور زندگی کے دوسرے تقاضے کنارے ہوتے جا رہے ہیں، جیسا کہ بہت سے لوگ اپنی شب وروز کی تگ ودو کے بعد اپنی معیشت کو مضبوط کرنے میں کامیاب تو ہوئے ہیں لیکن اخلاقی سطح پر ان کے طور طریقے اچھے نہیں رہے۔

کئی لوگوں نے جائز طریقوں کو استعمال کر کے دولت نہیں کمائی بلکہ انھوں نے ہر طرح کے طریقے استعمال کیے خواہ وہ جائز تھے یا ناجائز، بہت سے لوگ جھوٹ بول کر پیسے کماتے ہیں، اپنی چیز کی وہ خوبیاں بیان کرنا جو فی الواقع اس میں نہیں ہیں، اس کو دھوکہ دہی کہا جائے گا، بعض لوگ دوسروں کا استحصال کر کے اپنی تجوریوں کو بھرتے ہیں، وہ فیکٹریاں، کارخانے لگاتے ہیں، ان میں مزدور اور ملازمین کو رکھتے ہیں، کام تو ان سے خوب لیتے ہیں لیکن ان کی محنت کے مطابق

اجرت نہیں دیتے ،بعض لوگوں کی غربت وافلاس یا کسی اور مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کم اجرت پر کام کراتے ہیں،بعض اپنے ملازمین اور کام کرنے والوں کے پیسے وقت پر نہیں دیتے ، اورلوگوں کے پیسے اپنے پاس رکھ کراس سے مزید کمائی کرتے ہیں، کچھ لوگ ایسی چیزیں فروخت کرتے ہیں جو فی نفسہ جائز ہی نہیں،مثال کے طور پر نشہ آور اشیا،بعض لوگ اچھے مال میں خراب مال کو ملا کر بیچتے ہیں،بعض لوگ کم تولتے اور کم ناپتے ہیں،بعض لوگ اپنی چیز کو مارکیٹ ریٹ سے زیادہ پیسوں میں باتیں بنا کر اور گراہکوں کو پھنسا کر فروخت کرتے ہیں،بعض لوگ سودی کاروبار کرتے ہیں، یہ سب طریقے غلط ہیں،ظاہر ہے کہ اگر اس طرح کسی کے پاس بہت سی دولت بھی اکٹھی ہوجائے اوراس کی معیشت مضبوط بھی ہوجائے تب بھی اس کے وہ فوائد حاصل نہ ہوسکیں گے،اس کے دوررس نتائج صحیح ظاہر نہ ہوں گے۔

اس کے برعکس اگر اسلامی طریقوں سے انسان اپنی معیشت کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس سے اچھے ہی اثرات ظاہر ہوں گے، برے نتائج سامنے نہیں آئیں گے،مثال کے طور پر اسلام کہتا ہے کہ سچ بولا جائے ،اس سچائی کو خرید وفروخت میں بھی نافذ کرنا پڑے گا،یعنی سچ بولنا دوسرے تمام معاملات میں ضروری ہے،اسی طرح سچ بولنا خرید وفروخت اور کاروبار میں بھی لازمی ہے، اس اعتبار سے کوئی شخص اپنی چیز کو فروخت کرتے ہوئے اپنی چیز کی ایسی خوبیاں نہ بیان کرے جو اس میں نہ ہوں،کسی گراہک کو دھوکہ نہ دینے کی کوشش کرے،کسی گراہک کو دھوکہ دے کر روپیہ کا مال دس روپے میں فروخت کرنے کی کوشش نہ کرے، اسلام نے ناپ تول میں کمی کرنے سے منع کیا ہے، اس لیے کہ اس صورت میں گراہک کو نقصان پہنچتا ہے اور اس کی حق تلفی ہوتی ہے، اس لیے اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو اس طرح اس کے ذریعہ کمائی ہوئی دولت حرام ہوگی،یعنی اسلامی تعلیمات کے مطابق اگر ناپ تول میں کمی نہیں کی جاتی ہے تو اس سے گراہک کو نقصان نہ ہوگا، ملاوٹ کرنے کو بھی منع کیا گیا ہے،اگر کوئی شخص خالص چیز بیچتا ہے اور اس میں ملاوٹ نہیں کرتا ہے تو اس میں بیچنے والے کو تو فائدہ ہوگا ہی،لیکن خریدنے والے کو بھی فائدہ ہوگا،کیوں کہ اسے خالص چیز مل گئی۔

سچائی کے ساتھ تجارت کرنے کے فائدے کل بھی تھے اور آج بھی ہیں، آج جھوٹ کی وجہ سے لوگوں کا دوکانداروں، کمپنیوں وغیرہ سے اعتبار اٹھ گیا ہے، اگر گراہکوں کو یہ معلوم ہو کہ فلاں شخص اپنی چیزوں کو سچائی کے ساتھ بیچتا ہے، کسی سے ناجائز نفع نہیں کماتا، اشیا میں ملاوٹ نہیں کرتا، کم ناپ تول نہیں کرتا، تو یقینا لوگ اس کے پاس سے چیزیں خریدیں گے، ایسے شخص کا کاروبار بہت تیزی کے ساتھ بڑھے گا اور اس کی معیشت مضبوط ہوگی، چنانچہ تجارت کرنے کے لیے تمام مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ تجارت میں اسلامی طریقوں کو اختیار کریں۔

روزگار کے لیے فی زمانہ ملازمت کا راستہ بھی ہے، جو لوگ ملازمتیں حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں چاہئے کہ وہ ملازمتوں کے اعتبار سے اپنی صلاحیتوں کو نکھاریں، یعنی جس سیکٹر اور شعبے میں جانا ہے، اس سے متعلق اپنے اندر مہارت پیدا کریں، اگر دفاتر میں ملازمت کرنی ہے تو اسی حساب سے اپنے اندر وہ تعلیمی لیاقت پیدا کی جائے، اور اگر کوئی شخص تدریس میں ملازمت حاصل کرنے چاہتا ہے تو اسی نوع کی تیاری کرے، اور اگر انتظامی امور میں ملازمت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس طرح کی تعلیم بھی حاصل کرے اور تربیت بھی، یہ مقابلے کا زمانہ ہے، اس میں صلاحیتوں اور مہارتوں کو ترجیح دی جاتی ہے، پرائیویٹ سیکٹروں میں اچھی تعلیم اور صلاحیت کو فوقیت دی جاتی ہے، اگر اپنے کاموں اور میدانوں میں مہارت حاصل کرلی جائے، تو ملازمت ملنا آسان ہوتا ہے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ جہاں بھی رہیں، جس ڈپارٹمنٹ، دفتر یا شعبے میں ملازمت کریں، ایمانداری اور دیانت داری سے کام کریں، تاکہ ان کی روزی خالص ہو، جس سے انھیں بھی فائدہ پہنچے اور ان کے بچوں کو بھی حقیقی فائدہ پہنچے اور کسی کی حق تلفی نہ ہو، معیشت کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے، اگر مسلمان اسلامی طور طریق کو اپنے کاروبار، ملازمت اور اقتصادیات میں اختیار کریں گے تو یقینا ان کی معیشت مضبوط بھی ہوگی اور اس کے بہتر نتائج بھی سامنے آئیں گے۔

جن کی دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں!

مولانا محمد الیاس گھمن حفظہ اللہ

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو امتحان کی اور آخرت کو جزاء وسزا کی جگہ بنایا ہے، یہاں آزمائش کے لیے خوشیاں بھی عطاء کی ہیں کون ان کو میری نعمت اور احسان سمجھ کر شکر ادا کرتا ہے اور غم بھی پیدا فرمائے ہیں کون ان کو اپنی غلطی سمجھ کر میری طرف رجوع کرتا ہے؟ انسان کو دنیا میں یہ دونوں چیزیں نصیب ہوتی ہیں لیکن افسوس صد افسوس کہ صرف اس کو غم ہی یاد رہتے ہیں، پریشانی کے آزمائشی لمحات میں اپنے رب سے گلے شکوے، شکایتیں اور ناشکری ہی کرتا ہے، اس ذات کی طرف سے ملنے والی خوشیوں اور نعمتوں کو سرے سے بھلا دیتا ہے بلکہ ان کو اللہ کا محض فضل، احسان اور کرم سمجھنے کے بجائے اپنا ''کمال'' سمجھتا ہے، اے کاش! ہمیں اپنی ان دونوں غلطیوں کا احساس ہو سکے، خوشیوں کو اس کی عطاء سمجھیں اور شکر ادا کریں، مصائب اور پریشانیوں کو بھی اللہ کا انعام سمجھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ جس مسلمان کو دنیاوی آزمائشوں میں مبتلا کرتے ہیں تو اس کی دعاؤں کو اپنی بارگاہ میں قبولیت سے نوازتے ہیں، یہ اس ذات کا کرم، بے پناہ کرم اور محض کرم ہی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے دل میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہم اللہ کی مخلوق، اس پر ایمان لانے اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں، وہ ذات ہم سے پیار کرتی ہے، دنیا میں خوشیاں عطاء کر کے آخرت کی حقیقی خوشیوں کا احساس دلاتی ہے کہ دیکھو دنیا کی خوشیاں عارضی ہیں ان کے ختم ہونے کا دھڑکا سا لگا رہتا ہے، چھن جانے کا خوف دامن گیر رہتا ہے، جبکہ آخرت کی خوشیاں مستقل ہیں، ان کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ کوئی چھین نہیں سکتا ہے۔

اسی طرح وہ ذات دنیاوی پریشانیاں دے کر آخرت کی حقیقی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کا موقع دیتی ہے کہ دیکھو تم دنیا کی پریشانیوں کو جو وقتی اور عارضی ہیں ان کو برداشت نہیں کر سکتے تو

آخرت کی لمبی پریشانیاں کیسے برداشت کرسکو گے؟ اللہ تعالیٰ ہمیں جھنجوڑنے اور غفلت سے دور کرنے کے لیے تنبیہ کے طور پر چند پریشانیوں سے دوچار کرتے ہیں تا کہ یہ بندے آخرت کی بڑی اور لمبی پریشانیوں سے بچنے کی وہ تدابیر اختیار کرسکیں جو میرے احکامات اور میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں موجود ہیں بلکہ قرآن وسنت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عین اس وقت بھی جب کسی مسلمان پر مصائب ومشکلات نازل ہورہے ہوتے ہیں اس وقت بھی وہ اللہ کے کرم کے سایہ میں ہوتا ہے اگر وہ کسی گناہ کی وجہ سے اس پر نازل ہورہی ہیں تو سنبھلنے کا موقع مل رہا ہوتا ہے بلکہ اس شخص کو اس وقت اللہ تعالیٰ ایک بہت بڑی نعمت عطاء فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کی دعاء قبول فرماتے ہیں۔

ذیل میں ہم چند ایسے اشخاص کا تذکرہ کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی پریشانی سے دوچار کرکے ان کی دعاؤں کو قبولیت کا شرف عطاء فرماتے ہیں۔

بے بس کی دعاء: انسان کی زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ وہ بالکل بے بس ہوجاتا ہے، یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب اللہ کریم اس کی دعاء کو قبول فرماتے ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ جس وقت خدا انسان کو نوازنا چاہتا ہے عین اسی وقت یہ اس ذات کے گلے شکوے شروع کر دیتا ہے، اس لیے بھرپور کوشش کرنی چاہیے کہ ایسے وقت کو خدا کی ناشکری میں ضائع کرنے کے بجائے دعائیں مانگنے میں خرچ کیا جائے۔ قرآن کریم میں ہے:

(بھلا اللہ کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے؟ جو) بے کس و بے بس انسان کی دعاء کو قبول اور اس سے حالات کی سختی کو دور فرماتا ہے۔ (سورۃ النمل)

مریض کی دعاء: انسان کی زندگی میں کبھی صحت غالب رہتی ہے اور کبھی مرض غلبہ پالیتا ہے لیکن اللہ کا کرم دیکھیے کہ مرض اس کے گناہوں کا کفارہ اور بلندی درجات کا ذریعہ بن جاتا ہے اس لئے تقدیر خداوندی سے اگر کوئی بیماری لاحق ہوجائے تو اس بات کا خیال کرنا چاہیے کہ ایسے انسان کی دعاء اللہ جلد قبول فرماتے ہیں، علاج کے ساتھ ساتھ دعاؤں کا بھرپور اہتمام کرنا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مریض جب تک حالت مرض میں رہتا ہے تو اس کی دعاء رد نہیں کی جاتی۔ (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر ۹۵۵۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مریضوں کی عیادت کیا کرو اور ان سے اپنے لیے دعاء کی درخواست کیا کرو کیونکہ مریض کی دعاء قبول ہوتی ہے۔ (الدعاء للطبرانی، حدیث نمبر ۱۱۴۳)

اس سے معلوم ہوا کہ مریض کو اپنے لیے بھی دعاء کرنی چاہیے اور عیادت کے لیے آنے والوں کو بھی مریض سے دعاء کی درخواست کرنی چاہیے۔

مسافر کی دعاء: انسان کا جسم راحت کا خواہش مند ہوتا ہے لیکن سفر میں اسے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اللہ کریم کا کرم دیکھیے کہ انسان پر سفر کی ہلکی سے پریشانی آتی ہے تو اللہ اس پر اپنا کرم یہ فرماتے ہیں کہ اس کی دعاء کو جلد قبول فرما لیتے ہیں، ہم لوگ آئے دن سفر کرتے ہیں، افسوس کہ سفر میں غیر شرعی کاموں میں لگے رہتے ہیں، بالخصوص خواتین جب سفر کرتی ہیں تو دوسروں کے گلے شکوے اور غیبت کرتی رہتی ہیں جبکہ یہ وقت اللہ سے مانگنے کا ہوتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین دعائیں قبول ہوتی ہیں (ان میں سے ایک) مسافر کی دعاء ہے۔ (ترمذی، حدیث نمبر ۳۳۷۰)

باپ کی دعاء: اولاد اللہ کی نعمت ہے، اللہ جسے یہ نعمت عطاء فرماتا ہے تو اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھا دیتا ہے، اولاد کی پرورش، رہائش، خوراک، تعلیم، تربیت اخلاق، ادب واحترام اور دینی احکامات پر عمل کی پابندی کرانا یہ والدین پر اولاد کے بنیادی حقوق ہیں، ظاہر سی بات ہے کہ ان حقوق کی ادائیگی میں بسا اوقات انسان کو پریشانیاں بھی لاحق ہوتی ہیں، ایسے وقت میں ایک باپ کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ لیکن اللہ کریم کا کرم دیکھیے اولاد کی نعمت بھی عطا فرماتے ہیں ان کے حقوق کی ادائیگی کے لیے کوئی پریشانی لاحق ہو تو اللہ تعالی

اولاد کے حق میں دعاء کو جلد قبول فرماتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین طرح کے لوگوں کی دعائیں رد نہیں کی جاتی (ان میں سے ایک) والد کی دعاء اپنی اولاد کے لیے۔ (ترمذی، حدیث نمبر ۳۴۰۷)

انصاف کرنے والے حاکم کی دعاء: جس کو کسی قوم پر حاکم بنا دیا جائے، تو اس قوم کو انصاف فراہم کرنا حاکم کے ذمہ ہوتا ہے، معاشرے میں جرائم کی کثرت اور مجرموں کا طاقتور ہونا ایک زمینی حقیقت ہے، ایسے میں انصاف کی فراہمی سب سے مشکل کام ہوتا ہے لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ اس مشکل مرحلے سے گزارتا ہے تو اس کو دنیا میں یہ انعام عطاء فرماتا ہے کہ ایسے شخص کی دعاء کو جلد قبول فرماتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین طرح کے لوگوں کی دعائیں رد نہیں کی جاتی (ان میں سے ایک) امام عادل کی دعاء ہے۔ (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۱۷۵۲)

ذکر کرنے والے کی دعاء: اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بے پناہ فضائل و مناقب اور اس کے فوائد وثمرات ہیں، ایسا شخص جو کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو اس کی دعاء بھی اللہ جلد قبول فرماتے ہیں، یہ مستجاب الدعوات بننے کا نسخہ اکسیر ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین لوگوں کی دعاء اللہ تعالیٰ رد نہیں فرماتے (ان میں سے ایک) کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنے والے کی دعاء بھی ہے۔ (الدعاء للطبرانی، حدیث نمبر ۱۳۱۶)

حاجی اور عمرہ کرنے والے کی دعاء: حج اور عمرہ کرنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ یہ سعادت نصیب فرماتے ہیں کہ ان کی دعاؤں کو قبول فرماتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غازی

فی سبیل اللہ، حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے اللہ کے مہمان ہیں ان کو اللہ نے پکارا تو انہوں نے لبیک کہا وہ اللہ سے دعاء مانگتے ہیں تو اللہ ان کو عطاء فرماتے ہیں۔ (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۲۸۸۴)

روزہ دار کی دعاء: روزے میں صبح صادق سے غروب آفتاب بھوک، پیاس اور جائز جنسی تعلقات سے رکنا ہوتا ہے اگرچہ یہ کچھ وقت کے لیے ہوتا ہے صبح سحری میں بھی کھانا وغیرہ کی اجازت ہوتی ہے اور شام کو افطاری میں بھی کھانے پینے کا حکم ہے، اس تھوڑے سے وقت میں اللہ کو راضی کرنے اور اس کا حکم ماننے کے لیے جو برداشت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ کھانے پینے کی تمام چیزیں سامنے رکھی ہوئی ہیں لیکن بندہ کچھ نہیں کھا رہا اس پر اللہ تعالیٰ دنیا میں ہی یہ انعام عطاء فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کی دعاء کو قبول فرماتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمیوں کی دعاء رد نہیں کی جاتی (ان میں سے) ایک روزہ دار ہے یہاں تک کہ وہ افطار کر لے۔ (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۱۷۵۲)

مسلمان بھائی کے لیے عدم موجودگی میں دعاء: کسی کے سامنے اس کی اچھائی بیان کرنا بھی اچھی بات ہے لیکن اس میں کبھی دنیاوی اغراض ومقاصد کو دخل ہوتا ہے اور جو دعاء اپنے مسلمان بھائی کی عدم موجودگی میں کی جائے اس میں یہ شائبہ بھی نہیں ہوتا اس اخلاص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ایسے مسلمان کی دعاء کو قبول فرماتے ہیں جو اپنے ایک مسلمان بھائی کیلیے اس کی عدم موجودگی میں کرے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی مسلمان اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں اس کے لیے دعاء کرتا ہے تو ایک مقرر فرشتہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ جو تو نے اپنے بھائی کے لیے مانگا ہے اللہ تجھے بھی وہی عطاء کرے۔ (مسلم، حدیث نمبر ۷۰۲۷)

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر حال میں دعاء مانگنے والا بنائے اور ہماری دعاؤں کو قبول بھی فرمائے۔ آمین بجاہ النبی الامی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم۔

تعزیت، تعزیتی جلسے اور سوگ و برسی منانا

مفتی شعیب احمد بستوی معین مفتی دارالافتاء مظاہر علوم سہارنپور

سب سے پہلے ہم سبھی کے ذہنوں میں یہ بات اچھی طرح محفوظ رہنی چاہئے کہ شریعت نے جو کام جس وقت جس طرح کرنے کے لئے بتلایا ہے اگر اس کے موافق عمل ہوگا تو وہی شرعی عمل کہلائے گا اور اسی پر اجر وثواب ملے گا، اور اگر شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف ہوگا تو نہ وہ عمل شرعی ہوگا اور نہ اس پر اجر وثواب ملے گا، بلکہ بعض مرتبہ وہی عمل باعث وبال بن جائے گا۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد چند ایسی باتوں کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے جس میں عملی طور پر ہم کوتاہی کرتے ہیں۔

۱- تعزیت: تعزیت کہتے ہیں کہ جب کسی کا انتقال ہوجائے تو اس میت کے اہل خانہ کے غم میں شریک ہونا، یعنی ان کو صبر و تسلی کی تلقین کرنا، دل جوئی کرنا اور اس غم پر صبر کرنے کے اجر وثواب بیان کرنا۔

احادیث شریفہ میں اس کی بہت فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، مثلاً ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ تعزیت کرنے والے کو قیامت کے دن اللہ تعالی بزرگی اور کرامت کا لباس پہنائیں گے، اسی طرح یہ بھی وارد ہے کہ جس قدر ثواب مصیبت زدہ کو اس صدمہ پر صبر کرنے کی وجہ سے ملے گا اتنا ہی ثواب اس تعزیت کرنے والے کو ملے گا، وغیر ذلک

لہٰذا حتی الامکان تعزیت ضرور کرنا چاہئے، مگر اس کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ میت کی تدفین کے بعد یا اس سے پہلے گھر جا کر اس کے تمام اہل خانہ کو تسلی دے، دلجوئی کرے، صبر کی تلقین و ترغیب دے، میت کے لئے دعائیہ کلمات اور خیر کی باتیں کہے، الغرض حالات اور موقع کے

اعتبار سے جو الفاظ موزوں ومناسب ہوں وہ کہے جائیں، کیونکہ مقصود صبر وتسلی دلانا ہے، اسی لئے شریعت میں اس کے لئے نہ تو مخصوص الفاظ ہیں اور نہ کوئی مخصوص مضمون وطریقہ منقول ہے، البتہ احادیث میں چند جملے تعزیت کے مروی ہیں جو ہیں تو بہت مختصر لیکن بڑے جامع، مثلاً ایک حدیث میں ہے: **أعظم الله أجرک وأحسن عزاک و غفر لمیتک** (کبیری) خدا تم کو اجر عظیم عطا فرمائے اور تیرے صبر کا بہترین صلہ عطا فرمائے اور تیرے میت کی بخشش کرے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تعزیت ایک مسنون اور شرعی عمل ہے اور باعث اجر وثواب ہے اور جس طرح خود حاضر ہو کر تعزیت کرنا مسنون ہے اسی طرح اگر کوئی دور ہو یا مجبوری کی وجہ سے خود حاضر نہ ہو سکے تو خط وغیرہ کے ذریعہ بھی تعزیت کرسکتا ہے۔ ان شاء اللہ ثواب بھی حاصل ہوگا۔

مگر جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ موجود اور حاضر کے لئے تعزیت کی مدت تین دن تک ہے، تین دن کے بعد مکروہ ہے، اسی طرح ایک مرتبہ تعزیت کرنے کے بعد دوبارہ تعزیت کرنا بھی مکروہ ہے، ہاں اگر کوئی دور ہو یا سفر میں ہو تو جب واپس آئے اس وقت تعزیت کرسکتا ہے۔

لہٰذا تعزیت جلد سے جلد کرنی چاہئے اس لئے کہ اصل تعزیت وہی ہے جو اول مصیبت کے وقت کی جائے، جب اہلِ میت کو صبر آجائے تو پھر بلا مجبوری ہفتوں اور مہینوں کے بعد تعزیت چہ معنیٰ دارد؟

۲۔ تعزیتی جلسے: نہ یہ مسنون ہے نہ مستحب اور نہ خیر القرون میں اس کی کوئی نظیر موجود ہے، البتہ چونکہ تعزیت کرنا حدیث سے ثابت ہے اس لئے ہمارے اکابر نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخصیت ایسی ہو کہ اس کے انتقال سے بہت سے لوگوں کو صدمہ ہو، بہت سے لوگ تعزیت کی ضرورت محسوس کرتے ہوں، تو سب کو الگ الگ تعزیت کرنے کے بجائے ایک مختصر مجلس منعقد کر کے اس میں تعزیت وغیرہ کا مضمون بیان کر کے صبر ورضا کی تلقین کردی جائے،، جانے والے کے قابل تقلید اوصاف کی طرف رہنمائی کر کے اس پر عمل کی ترغیب دی جائے اور اس کے لئے دعائے مغفرت کی جائے تو شرعاً اس کی گنجائش

ہے کہ اس میں بہت سے لوگ سفر اور مالی اخراجات اور دیگر دوسری پریشانیوں سے بچ جائیں گے، متعلقین میت پر بھی مہمانوں کی آمد سے بار نہیں پڑے گا۔

مگر آج کل جو رواج بنتا جارہا ہے کہ رسمی طور پر جگہ جگہ تعزیتی جلسے کئے جاتے ہیں، ایصال ثواب کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں، تعزیتی جلسوں کا اعلان و اشتہار دیا جاتا ہے، اخبارات میں خبریں شائع کی جاتی ہیں، واعظین ومقررین کو مدعو کیا جاتا ہے اور پھر اس میں مرنے والے کا مرثیہ پڑھا جاتا ہے، نظمیں پڑھی جاتی ہیں، تقریروں میں انتہائی مبالغہ آمیزی کی جاتی ہے، اور قابل افسوس بات یہ ہے کہ یہ سب دین سمجھ کر دیندار طبقہ کی طرف سے کیا جاتا ہے، لہٰذا معلوم ہونا چاہئے کہ شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور خطرہ یہ ہے کہ ہمارا یہ عمل کہیں ہمارے لئے گرفت اور مواخذہ کا سبب نہ بن جائے۔

لہٰذا مکمل احتراز کیا جائے کیونکہ یہ بدعت زور پکڑتی جارہی ہے۔

۳- سوگ اور برسی منانا: حدیث شریف کے مطابق کسی کی موت پر صرف تین دن تک سوگ منانے (اظہارِ غم) کی اجازت ہے البتہ شوہر کے انتقال پر اس کی عورت چار ماہ دس دن سوگ منائے گی اس کے بعد نہیں۔

جو یہ رواج ہے کہ جب کسی کے یہاں انتقال ہوجائے تو اس کے بعد پہلی مرتبہ جو عید یا بقرعید آئی ہے تو میت کے اہل خانہ نہ عید مناتے ہیں اور نہ اچھے اور نئے لباس پہنتے ہیں، اچھے اور عمدہ کھانے بھی نہیں پکاتے ہیں، عورتیں زیب وزینت نہیں کرتیں، نہ کوئی کسی کے گھر جاتا ہے، یعنی اپنے قول وفعل سے نہ کسی مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور نہ اس کو پسند کرتے ہیں بلکہ اس کو برا اور معیوب تصور کرتے ہیں، اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کرتے ہیں کہ آئندہ اس تاریخ میں اپنے یہاں کسی خوشی کا کوئی پروگرام (شادی وغیرہ) نہیں رکھتے بلکہ غیروں کی طرح اس دن کو یوم وفات کے طور پر مناتے ہیں اور بتکلف غم اور رنج کا اظہار کرتے ہیں۔

یادرکھیں یہ سب لغویات اورواہیات ہیں، دین وشریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ مذموم اورقابل ترک چیزیں ہیں بلکہ خطرہ یہ ہے کہ قابل مواخذہ نہ ہوں۔

روایت ہے کہ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کے والد کا جب انتقال ہوا تو انھوں نے تین دن کے بعد خوشبو منگوائی اوراسے لگایا اور فرمایا کہ مجھے اس وقت اس کی کوئی ضرورت نہیں مگر چونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ (اظہارغم) جائز نہیں، اس لئے میں نے یہ خوشبو لگارکھی ہے، ظاہر ہے کہ خوشبو خوشی کے موقع پر لگائی جاتی ہے نہ کہ غم کے موقع پر۔

اسی طرح کا واقعہ ام المومنین حضرت زینبؓ سے بھی منقول ہے کہ انھوں نے اپنے بھائی کے انتقال پر تیسرے دن خوشبو منگا کر لگائی۔

ان دونوں امہات المومنین کے عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آج ہم جو کچھ کررہے ہیں سب غلط اورشریعت کے خلاف چیزیں ہیں اور خدانخواستہ اس کو دین سمجھ کر کررہے ہوں تو پھر آخرت کی پکڑ یقینی ہے اس لئے کہ یہ بدعت سیئہ ہے اور بدعت سیئہ حدیث شریف کے مطابق کھلی گمراہی ہے اورگمراہی جہنم کا راستہ دکھاتی ہے۔اللھم احفظنا منہ

قرآن کریم کی عظمت واہمیت:

☆ حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”قرآن کریم کی تلاوت اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام کیا کرو، اس عمل سے آسمانوں میں تمہارا ذکر ہوگا اور یہ عمل زمین میں تمہارے لیے ہدایت کا نور ہوگا“۔(سنن بیہقی)

☆ حضرت سعد بن عبادہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص قرآن پڑھ کر بھلادے تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے یہاں اس حال میں آئے گا کہ کوڑھ کے مرض کی وجہ سے اس کے اعضاء جھڑے ہوئے ہوں گے۔ (سنن ابوداؤد)

ماہِ شعبان کے نفل روزوں کی شرعی حیثیت

مولانا اشتیاق احمد قاسمی، مدرس دارالعلوم دیوبند

آدمی کے اندر دو صفتیں پائی جاتی ہیں: ایک ''روحانیت''، دوسری ''حیوانیت''؛ پہلی صفت میں انسان ترقی کر کے فرشتوں کے مشابہ ہوجاتا ہے؛ اس لیے اسے ''مَلکیت'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسری صفت میں اضافہ کی وجہ سے انسان عام حیوانوں کے مشابہ ہوجاتا ہے؛ اس لیے اس کو ''بہیمیت'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، روزہ کی برکت سے حیوانیت روحانیت کے تابع ہوجاتی ہے، آدمی خواہشات کو دبا کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہوجاتا ہے اور متقین کی صف میں شامل ہوجاتا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت میں روحانیت اور ملکیت کے بڑھانے کے لیے جہاں فرض روزوں کی تعلیم دی ہے، وہیں نفل روزے رکھے ہیں اور امت کو اس کی ترغیب و تعلیم بھی دی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نفلی روزے (کبھی) مسلسل رکھنے شروع کرتے یہاں تک کہ ہمیں خیال ہوتا کہ اب ناغہ نہیں کریں گے اور (کبھی) بغیر روزے کے مسلسل دن گذارتے؛ یہاں تک کہ ہمیں خیال ہونے لگتا ہے کہ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلا روزہ ہی رہیں گے۔ نیز فرماتی ہیں کہ: میں نے رمضان کے علاوہ کسی مہینے کا پورا روزہ رکھتے نہیں دیکھا، اسی طرح کسی مہینے میں شعبان سے زیادہ نفلی روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ (مشکوٰۃ) بعض روایتوں میں ہے کہ شعبان کے مہینہ میں بہت کم ناغہ کرتے تھے، تقریباً پورے مہینے روزے رکھتے تھے۔ (الترغیب والترہیب ۲: /۱۱۷)

اسلام اعتدال و میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے، نفل عبادتیں اتنی ہی محمود ہیں، جن کے ساتھ آدمی اپنے جسم و جان، عزیز و قریب اور زیردستوں کی پوری ذمہ داری کو بہ حسن و خوبی نبھا سکے، سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر شفقت کرتے ہوئے نوافل میں اعتدال کی راہ بتائی؛ اس

لیے ہر مہینے میں صرف تین دن روزہ کو صوم الدہر (ہمیشہ روزہ رہنے) کے برابر بتایا، اور مزید قوت وطاقت ہو تو ایک دن روزہ ایک دن فاقہ کر کے نصف ماہ روزہ کی اجازت دی اور قرآن پاک کو مہینہ میں ایک بار ختم کرنے کی تعلیم دی اور اگر ہمت وطاقت ہو تو ہفتہ میں ایک بار ختم کی اجازت دی۔ (مشکوٰۃ: ص ۱۷۹) اس لیے ہمیں اعتدال کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔

شعبان کے مہینے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کثرت سے روزے رکھنے کی علماء نے کئی حکمتیں بیان کی ہیں:

۱– چوں کہ اس مہینہ میں اللہ رب العزت کے دربار میں بندوں کے اعمال کی پیشی ہوتی ہے؛ اس لیے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میں چاہتا ہوں کہ جب میرے اعمال کی پیشی ہو تو میں روزے کی حالت میں رہوں،۔ (نیل الاوطار ۴/ ۲۴۶)

۲– حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ: پورے سال میں مرنے والوں کی فہرست اسی مہینے میں ملک الموت کے حوالے کی جاتی ہے؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بارے میں ملک الموت کو احکام دیے جائیں تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزے سے ہوں۔ (معارف الحدیث ۴/ ۱۵۵)

۳– رمضان المبارک کے قریب ہونے اور اس کے خاص انوار وبرکات سے مناسبت پیدا کرنے کے شوق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کے مہینہ میں روزے کا اہتمام کثرت سے فرماتے تھے، جس طرح فرض نمازوں سے پہلے سنتیں پڑھتے تھے، اسی طرح فرض روزے سے پہلے نفلی روزے رکھا کرتے تھے اور جس طرح فرض کے بعد سنتیں اور نفلیں پڑھتے تھے؛ اسی طرح رمضان کے بعد شوال میں چھ روزے رکھتے اور اس کی ترغیب بھی دیا کرتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جیسا کہ معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کے تقریباً پورے مہینے روزہ رکھتے تھے، دوسرے مہینوں کے مقابلے میں اس مہینہ میں اہتمام زیادہ تھا، اسی طرح چوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت پر بڑے شفیق، رؤف اور

رحیم تھے؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو بتایا کہ تم میری ہمسری نہیں کرسکتے، اس لیے تم لوگ شعبان میں روزہ رکھ سکتے ہو؛ لیکن نصف شعبان آتے ہی روزہ رہنا بند کردو پھر جب رمضان آئے تو نئے نشاط کے ساتھ روزہ شروع کرو! (ابن ماجہ) ترمذی شریف کی ایک روایت میں ہے: اذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلاَ تَصُوْمُوْا (۱/ ۵۵) جب شعبان کا مہینہ آدھے پر آجائے تو روزہ نہ رہو! (نیز دیکھئے بلوغ المرام ۱۳۹)

خلاصہ یہ کہ پورے مہینہ یا اکثر دنوں میں روزہ رہنا سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے، ہمارے لیے نصف شعبان تک روزہ رہنا سنت ہے؛ لیکن اس کے بعد روزہ رہنا خلافِ سنت ہے، محدثین نے اس ممانعت کو تنزیہی پر محمول کیا ہے، ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ سرکارِ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم امت پر شفقت کے طور پر ہے تا کہ رمضان المبارک کے فرض روزے رکھنے میں ضعف محسوس نہ ہو؛ بلکہ نشاط، چستی اور حشاش بشاش ہونے کی حالت میں رمضان کا روزہ شروع کیا جاسکے۔ (مرقات)

پندرہویں شعبان کا روزہ: پندرہویں شعبان کے روزے کے سلسلے میں ایک حدیث شریف سنن ابن ماجہ میں ہے، اذَا كَانَتْ لَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَقُوْمُوْا لَيْلَهَا وَصُوْمُوْا يَوْمَهَا, فَانَّ اللهَ يَنْزِلُ فِيْهَا لِغُرُوْبِ الشَّمْسِ الَى سَمَاءِ الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ: أَلاَ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَ لَهُ! أَلاَ مُسْتَرْزِقٌ فَأَرْزُقَهُ! أَلاَ مُبْتَلىً فَأُعَافِيَهُ! أَلاَ كَذَا! أَلاَ كذا! أَلاَ كذا! حَتّٰى يَطْلَعَ الْفَجْرُ (سنن ابن ماجہ، حدیث ۱۳۸۴)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب نصف شعبان کی رات ہوجائے تو اس کی رات کو قیام کرو (نماز پڑھو) اور اس کے دن کو روزہ رکھو؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس رات غروبِ شمس کے وقت آسمانِ دنیا پر نزولِ اجلال فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ: ہے کوئی معافی مانگنے والا کہ میں اس کو معاف کروں؛ ہے کوئی رزق طلب کرنے والا کہ میں اس کو رزق دے دوں؛ ہے کوئی (مصیبت میں) مبتلا کہ میں اسے اس سے بچادوں؛ ہے کوئی ایسا، ہے کوئی

ایسا، یہاں تک کہ صبحِ صادق طلوع ہوجاتی ہے۔

اس حدیث شریف میں پندرہویں شعبان کے روزے کا حکم ہے؛ مگر اس حکم کو وجوب یا سنت پر محمول نہیں کیا جاسکتا:

خلاصہ یہ کہ پندرہویں شعبان کے روزے کو نہ تو واجب وسنت کہا جاسکتا ہے، نہ ہی بدعت کہہ کر بالکل رد کیا جاسکتا ہے؛ بلکہ اس کو مستحب کہا جائے گا، بعض فقہاء نے مرغوبات (پسندیدہ) روزوں میں شامل کیا ہے: جیسا کہ فتاویٰ عالم گیری (۱/ ۲۰۳) میں ہے اور بعض نے ''مستحب'' کی تعبیر اختیار فرمائی ہے؛ جیسا کہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (۶/ ۵۰۰) اور تعلیم الاسلام مفتی کفایت اللہ صاحب (۴/ ۶۶) میں ہے: اس لیے انفرادی طور پر اگر کوئی شخص پندرہویں شعبان کا روزہ رکھے تو اس سے منع نہیں کیا جائے گا: بلکہ وہ اس کی برکات کا پانے والا کہلائے گا؛ اس لیے کہ اس کی فضیلت ایک حدیث میں مذکور ہے، جس کی سند ضعیف ہے، اور فضائل میں ضعیف حدیث قابلِ قبول ہوتی ہے۔

فتـــاوی

انتخاب: عبداللہ خالد قاسمی خیرآبادی

س : موجودہ دور کے مشاعرے اوران میں شرکت ازروئے شرع کیسی ہے؟

ج : موجودہ زمانہ میں منعقد ہونے والے اکثر مشاعروں میں ایسے عامی شاعر بھی شریک ہوتے ہیں جن کی شاعری بالکل غیر سنجیدہ اوراخلاق سے گری ہوئی ہوتی ہے،شرعی حدود و قیود کا بھی لحاظ نہیں رہتا،شاعرات اور سامعات کی شرکت آج کل کے مشاعروں میں ضروری ہے انہیں سے مشاعرہ کی رونق ہوتی ہے۔اس لئے آج کل کا مشاعرہ بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہے۔ایسا مشاعرہ قابل ترک بلکہ واجب الترک ہے۔

س : چند سالوں سے بعض بڑے مدارس ’’جشن ختم بخاری‘‘ کا اہتمام کرنے لگے ہیں اس کے لیے اشتہار چھاپتے ہیں،لوگوں کو زبانی وتحریری دعوتیں دیتے ہیں اس کے لیے ان مدارس میں ہزاروں عوام وخواص کا اجتماع ہوتا ہے،شرعی طور پر اس کی کیا حیثیت ہے؟

ج : دعاء میں شرکت کے لیے کچھ لوگ آجائیں تو اس کی گنجائش ہے لیکن اس میں مبالغہ کرنا اشتہار چھاپنا اور دعوتیں دینا مناسب نہیں اس میں مفاسد آجاتے ہیں۔

س : ایک شخص اپنا آبائی گاؤں چھوڑ کر شہر میں مقیم ہے، وہیں اپنی جائیداد، مکان وغیرہ بنا لیا ہے اور گاؤں میں بھی اس کی جائیداد ہے لیکن سکونت وہاں نہیں ہے (گاؤں اور شہر کے درمیان مسافت ڈیڑھ سو کلومیٹر ہے) تو شخص مذکور جب گاؤں جائے تو نماز کا قصر کرے گا یا اتمام؟

ج : شہر میں مستقل طور پر قیام کا ارادہ ہے اور گاؤں کو بھی بالکلیہ نہیں چھوڑا ہے تو یہ شخص دونوں جگہوں میں مقیم ہوگا، گاؤں میں بھی اتمام کرے گا اور شہر میں بھی، فقہاء نے صراحت فرمائی ہے کہ وطن اصلی متعدد ہو سکتے ہیں۔

R.N.I. REGD. NO. 62469/95U.M.

URDU MONTHLY MAGAZINE

MAZAHIR ULOOM

SAHARANPUR



Rs. 15/-

MADRASA MAZAHIR ULOOM

SAHARANPUR-247001 (U.P.) INDIA, PH. 0132-2655542
E-Mail: jamiamazahir@gmail.com